بارش بهرا تهیلا

مسعود قمر

بارش بھرا تھیلا

بارش بھرا تھیلا

مسعود قمر

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS

بارش بھرا تھیلا شاعری مسعود قمر

اشاعت اوّل : 2020

اشاعت دوم : 2021

سرورق : فائزہ خان

پس سرورق : سبینا مسعود

سرورق تجوت : سعید ابراہیم

قیمت : 500

Barish Bhra Thaela

(Urdu poetry By Masood Qammar)

Copyright ©. 2020 2nd Edition

Except in Pakistan this book is sold subject to the condition that it shall not, by way of trade or otherwise, be lent, resold, hired out or circulated without the consent of the author or the publisher in any form of binding or cover other than that in which it is published.

Printed by:

Haji Munir & Sons Press, Lahore.

Price:

In Pakistan: Rs. 500.00

Published by:

سانجھ
SANJH PUBLICATIONS

Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.

Phone: 0331-4686276 Whatsup. 0333-4051741

e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com

Web: www.sanjhpublications.com

ISBN: 978-969-593 -325-1

اُس چہرے کے نام

جس نے کہا

کتاب میں میرا چہرہ نہ دکھانا

تشکر

میں اپنے دوست باسط میر، پروفیسر عبدالقیوم، سمیرا اکبر، فطرت سوہان، فائزہ خان، سمیرا قریشی مشتاق احمد، اپنے بیٹے خرم مسعود، اپنی محترمہ اشرف مسعود، بیٹی شازیہ مسعود، مریم مسعود، عائشہ مسعود، سبینا مسعود کا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ ان تمام احباب نے اس کتاب کو مرتب کرنے میں اپنے اپنے انداز میں میری مدد کی ہے۔ آخر پہ اُس چہرے کا خصوصی طور پہ شکریہ جس نے مجھ سے یہ کتاب لکھوائی

فہرست

نظموں کو پھانستا شکاری (فطرت سوہان)	11
وجودیت اور ترقی پسندی کے خمیر سے اُٹھا ''بارش بھرا تھیلا'' (ڈاکٹر سمیرا اکبر)	19
اکو حرف تیرے درکار (پروفیسر عبدالقیوم)	35
گوند کے درخت کا طبعی موت مرنے کا خواب	44
گلاب جامن سے بھرے سوسے	46
اس کے نام پہلی نظم	48
لہروں کو گننا مجرم	51
شہر کی لڑکیاں کس کونے میں ہیں	53
ساحل پہ پڑا گیلا لباس	55
درخت بنا آدمی	56
چھاتیوں سے محروم مائیں	57
تنہائی کا خط	59
لفظ ہمیش کی وبا	61
داغدار موت	63
بادشاہ کے شہر میں خریداری	64
جوتوں سے ناآشنا سڑکیں	65
ہر وقت کام میں جتی لڑکی	67
ان بکس میں بھیجا گیا سفید گلاب	69
گملے سے فرار	71
ایک نامکمل نظم	72
خامشی کے منتظر کان	74
زنگ آلود تالے میں اُگا درخت	75
خواب کے ساتھ بندھا شخص	77
چٹخورے باز	79
مصروفیت کی بنا پہ نہ کی جانے والی محبت	81
محبت کی ریزگاری	83

وقت بہت کم ہے 84
نجات دہندہ قینچی 86
گھٹیا اور حقیر موت 88
ہم بہت ہیں 90
نظم کی پیدائش 93
پیدائش کے لیے بوڑھا ہوتا آدمی 94
اکلاپے سے محروم شخص کا اوپیرا 96
میں دونوں جوتوں میں اپنے پاؤں ڈالنا چاہتی ہوں 97
سنگِ بنیاد کا کتبہ 99
اُدھار خریدی ہوئی موت 100
ایوا کے چمکتے سیب 101
تلاشِ ذات ۔ 102
اکو حرف درکار 103
انصاف نامی قبرستان کی ایک مجرم قبر 104
جعلی نظموں سے بھری ریل کار 106
قہقہوں سے بھرا تابوت 108
فضاؤں میں لکھا پوسٹل ایڈریس 110
احتیاط 112
سلاخوں کے درمیان لیا گیا بوسہ 113
برف کبھی بھی آگ بن سکتی ہے 115
احتیاطاً 117
کافی کے کپ کے ساتھ پڑی زندگی 119
دیوار سے لٹکا خواجہ سرا 120
بغیر معاوضہ لیے پہلا دیکھا گیا خواب 122
ہاؤس آف لوسٹ لیٹرز 125
موت کی تنہائی 127
پیدائش سے پہلے لکھا گیا گیت 129
قبر کی موت 131
محبت کی سرسوں 133
نظموں کا جیب کترا 135
کاغذ کا ناپ 137

نظم سے خالی کاغذ	139
آتش دان میں ٹھٹھرتی محبت	141
نیند کی خفیہ پگڈنڈیاں	143
دستانوں سمیت آٹا گوندھنا	144
درمیانی وقت میں محبت کی خواہش	146
کنارے پہ سوکھا آدمی	148
حاملہ برقعے	149
زیرِ ناف برف کی ڈلیاں	151
تو میرے دماغ کے دائیں کونے میں رہتی ہے	153
میلی ٹوپیاں	156
نظموں بھرا تکیہ	158
بریلی سُرنگ کی قیدی	160
اچھی کوالٹی کے کوئلے	162
خواب دیکھتے جگنو	164
خالی کمرے میں پڑا سیب	167
بچپن سے خالی مردہ	169
لیچی اور کچنار سے خالی درخت	171
برف کے اندر پڑی نظم کی گرمائش	173
مستقبل میں اکیلا ہو جانے والا آدمی	175
ہم پیشہ ور سوگوار ہیں	177
گھوڑے کے لیے وقت تھوڑا ہے	179
بیہودہ سوچوں سے وزنی ہونا	180
ماں جیسی ریاست	182
سیب کے انتظار میں قبر میں لیٹی لڑکی	184
بستر میں پڑا ماضی کا لحاف	186
ایک ٹانگ پہ کھڑی یاد	188
کھوئی ہوئی عورت کا درخت	190
ٹوٹی ہوئی سڑکیں	192
سمندر کی واپسی	194
شُکر گوار آدمی اور سرخ شراب	195
خواب بن جانے کا خواب	198

سمندر کا صحرا	199
بارشوں کے غسلخانے	201
خالی پن	203
حبس میں پیدا ہونے والا بچہ	205
سکوں سے خالی پنسلیں	207
تنہائی کا کورس	209
ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے کپڑے	210
دھمکیوں کی امربیل	212
توہینِ خوابِ محبت	214
دوحصوں میں بٹا بستر	215
خُدا اور فوٹو گرافر	217
جعلی نکاح ناموں پہ خُدا کے دستخط	219
فٹ بال	221
تنہائی کا موٹاپا	223
سوا نیزے پہ سنو مین	224
نظمیں جو مجھے پھاڑنی پڑتی ہیں	225
جاگتے خوابوں کو سلانا	226
ہنی مون مناتی گدھ	228
سائیکل چلاتی آتی موت	230
ہواؤں کا پوسٹل ایڈریس	232
واش بیسن کی خرخراہٹ	233
موت سے اُکتاہٹ	234
خراٹوں کی پوٹلی	235
کتابوں میں پڑا بوسہ	237
آزادی میں جکڑے ہوئے لوگ	239
بارش بھرا تھیلا	242
ڈرپوک بارش	243
پلیدِ شبد	245
نیندوں کے احسان اُٹھائے	247

نظموں کو پھانستا شکاری

نظمیں پھانستے شکاری نے ''بارش بھرا تھیلا'' زمین پر رکھا اور ''ہاؤس آف لوسٹ لیٹرز'' کی دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ لفافوں میں بند کچنار کے پھول، راگ ملہار اور لیچی کے ذائقے میں گندھی نظمیں ''آتش دان میں ٹھٹھرتی محبت'' ''کافی کی کڑوی بھاپ بن کر اُڑتی زندگی'' اور بدلتے وقت کی راہداریوں میں نظمائی سینکڑوں کہانیاں ہی تو اس کا اثاثہ تھیں جنہیں وہ اپنے ''ہم پیشہ سوگواروں'' کے نام ارسال کر کے سکون سے جینا چاہتا تھا لیکن ''ہاؤس آف لوسٹ لیٹرز'' کا بوڑھا سگاریا اپنے آتشدان کا پیٹ بھر کر کھانسنے لگا تھا کہ اُسے تاپنے کے لیے اور خطوط درکار تھے۔

نہیں..... نہیں میں اس بوڑھے آتش پرست کو تاپنے کے لیے اور خطوط ارسال نہیں کروں گا۔ بارش بھرا یہ تھیلا ہی تو میری کائنات ہے، نہ جانے کن کن منطقوں کے گرم سرد کو اپنی سانسوں کا خراج دے کر میں نے یہ نظمیں کشید کی ہیں، اور اب انہیں اس بوڑھے جہنمی کو سونپ کر لوٹ جاؤں، میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ خود کلامی کرتے شکاری نے زمین پر پڑے تھیلے کو سینے سے لگا کر بھینچا تو ایک دبی دبی چیخ نے اُسے چونکا دیا۔

مسعود!

یہ میں ہوں تمہاری..... تمہاری فطرت..... تم نے مجھے بھی ایک نظم سمجھ کر پھانس لیا ہے اور اب میں بھی تمہاری بارش بھری زنبیل میں بہت سی نظموں کے ساتھ پڑی ٹھٹھر رہی ہوں، ہمیں آزاد کر دو یا بوڑھے آتش پرست کو سونپ دو کہ وہ اپنی تاب کاری سے ہماری ٹھٹھری سانسیں بحال کر کے اپنا الاؤ روشن رکھ سکے۔

ہاں! ہاں! میں جانتا ہوں فطرت، میں نے تمہیں تمہارے دھنک رنگوں سمیت روشنائی میں گوندھ کر نظم کیا ہے کہ تم میری شاعری کا بلیغ استعارہ بن کر اُبھرو۔

مسعود

میں تمہاری فطرت..... بسیط مرغزاروں میں آزادی سے چوکڑیاں بھرتی غزالہ..... مجھے استعاروں میں قید کرو گے!

فطرت

ہاں! ہاں! میری نظمیں تمہیں امر کر دیں گی..... میری شاعری کی خوشبو چمن چمن مہکے گی تو تمہارے ہونے کا احساس بھی برگ وگل میں جا اُترے گا،..... میں نے بڑی محنت اور محبت سے تمہیں امر کیا ہے۔

مسعود!

یہ امر کرنا آخر ہے کیا؟ انارکلی کو دیوار میں چنوانے والوں نے اُسے مٹا کر امر کر دیا تھا اور تم دھنک رنگوں کو خشتِ حرف بنا کر ویسی ہی دیوار اٹھانا چاہتے ہو اور سمجھتے ہو کہ مجھے امر کر دو گے۔

مسعود

اس دُبدھا سے نکلو اور اپنی غزالہ کو بسیط دشت و دمن میں کُھل کر چوکڑیاں بھرنے دو..... کُھل کر اٹکھیلیاں کرنے دو۔

مجید امجد نے بھی تو یہی کہا تھا۔

چمن چمن میں بہ طغیانِ رنگِ لالہ پھرو
خُتن خُتن میں بہ انبوہ صد غزالہ پھرو

مسعود!

میں جانتی ہوں، تمہیں ہر عشق میں صرف چند نظمیں ہی ملیں اور تم نے اسی نظم گوئی کی سزا ٹرین کے آخری ڈبے میں بیٹھ کر عمر قید کی صورت کاٹی ہے..... اس انتظار میں..... کہ شاید وہ.....

تمہارے آخری سٹاپ تک پہنچنے سے پہلے تمہاری نظموں میں در آئے.....اور تم نے ہمیشہ اپنی مکمل شکست کے اعلان کو ٹالنے کے لیے کھل کر قہقہے لگائے ہیں، مگر اُداسی کی موٹی چوہیا نے تمہارے اندر گھس کر تمہارے قہقہے بھی کُتر دیئے ہیں۔ اُسے یہ بھی خبر ہے کہ تم نے قہقہوں کے تکیے تلے کیا کچھ چھپا رکھا ہے، مگر میں جانتی ہوں کہ اگر یہ کمینی چوہیا ایک دن سب کچھ کُتر بھی لے مگر تمہارے قہقہے اُس کے دانت کھٹے کر دیں گے۔

مسعود

میں جانتی ہوں کہ تم مکمل شکست کے اعلان سے پہلے اپنی نظموں بھرے تھیلے اپنے ہم پیشہ سوگواروں کو روانہ کرنا چاہتے ہو لیکن ''ہاؤس آف لوسٹ لیٹرز'' کے بوڑھے آتش پرست سے ڈرتے ہو۔

میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم مجھے رہا کیوں نہیں کرتے، تمہیں علم ہے کہ بسیط دشت و دمن اور لہلاتے مرغزار بھی اب راکھ کا ڈھیر ہیں، صنوبر کی خوشبو سے بھری بستی اُجڑ چکی ہے، میرے بابا کی عینک کی ایک آنکھ گھر کی دہلیز پر اور دوسری ٹارچر سیل کے باہر پڑی ہے.....اس کی ادھوری نظم فوجی جیپ کے ٹائروں نے کچل ڈالی ہے اور اب میں اپنے بابا کی دونوں آنکھیں ایک ساتھ کبھی چوم نہ پاؤں گی..... بابا کے دونوں جوتوں میں اپنے دونوں پاؤں ڈالنے کے لیے، بابا کی فریم جڑی ہنستی مسکراتی تصویر مسخ شدہ لاش کے تابوت میں سجانے کے لیے، اُن کی ریزہ ریزہ جبیں پر کفن ڈالنے کے لیے.....

سو تمہیں تمہاری نظمیں عزیز ہیں تو مجھے میری آزادی۔

فطرت!

پرندے آزاد ہو کر بھی کتنی اُڑان بھر لیں گے؟
وقت اور ہوائیں انہیں دبوچ کر پھر سے زمین پر دے ماریں گی۔
سو یہ کینچلی اُتار پھینکنا ممکن ہی نہیں، تمہارے لیے بھی بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

مسعود

تم اول آخر ایک جادوگر نما شاعر ہو اور استدلال کا بوم رینگ فضا میں پھینک کر اپنی جگہ جم

کر کھڑے رہتے ہو،.....تم خوب جانتے ہو کہ اُسے ہر حال میں پلٹ کر تمہارے پاس آنا ہے، یقیناً ہم سب زندانی ہیں، اور آزاد فضا میں پھینکا ہوا بوم رینگ، لیکن ''تمثیل الوہی لفظ و اشارے کی اسیر نہیں'' یہ لمحۂ نایاب مقناطیسی حصار کی طرح پھیل کر سب کو اپنی گرفت میں لیتا ہے، گویا محال بھی آخر ممکن تو ہے،.....شاید فاصلہ اور خود فراموشی ایک حقیقت ہوں، ہوسکتا ہے خشک پتہ ہری بھری جڑ سے بھی زیادہ حقیقی ہو، مجھے خبر ہے کہ ''خودسری تمہارا شیوہ نہیں، مگر اسی اسلوب میں تمہارا طلسم ہے اور لامتناہی شعبدے ہی تمہارا وجدان''۔

لیکن میں سب کچھ پھوٹتی کونپل میں ڈھونڈنے پر مُصر ہوں، لبریز لمحوں سے بچ کر بے کراں خالی پن میں جھانکوں

وہ ہے یا پھر نہیں ہے.....مگر کچھ تو ضرور ہے.....

مسعود

میں نے تمہاری نظم بن کر جان لیا کہ تم خوابوں سے بندھے ایک شخص ہو جو صبح دم سوئی ہوئی گھاس کو پوروں سے چھو کر خوابوں سے لبریز بچھڑی رات کا نقش تلاش کرتا ہے، جو مصروفیت کی بنا پر نہ کی جانے والی محبت کو تیز برانڈی کا گھونٹ جان کر باٹم اپ کرتا ہے، جس کے ہاتھ محبت کی ریزگاری سے بھی خالی ہیں۔ جس کا اندر خالی چیزوں سے بھرا پڑا ہے، جس کے ہاں نظم کی پیدائش تب ہوتی ہے جب دوسرے پلڑے میں پڑے باٹ روایت کے میوزیم میں رکھ دیئے جائیں، جو یہ جانتا ہے کہ ابدیت کے دوسری طرف کچھ بھی نہیں زندگی، زندگی سے پہلے بھی زندگی تھی اور زندگی کے بعد بھی زندگی ہے۔

سنو مسعود!

تم ایک ایسا گھر بنانا چاہتے ہو جس میں صرف دروازے ہوں لیکن وہ کبھی کھل نہ سکیں، تم دن کو سونا رات کو ابدی بنانا سمجھتے ہو،

تمہیں نظمیں لکھنے کے لیے کنوئیں سے پانی نکالنے جتنا زور نہیں لگانا پڑتا، اکیلے بس میں سفر کرتے دو ٹکٹیں خریدنا پڑتی ہیں، تمہاری نظموں کے مصرعے فرانسیسی وائین اور روسی ووڈکا سے جلا پاتے ہیں اور ان کے عنوانات سکاچ وہسکی تراشتی ہے۔

درحقیقت تم بلاکے کے پیراڈوکسیئے ہو، بیان مغائر اور ''محالِ مجسم'' تمہارے وہ ہتھیار ہیں

جن سے تم قاری کو بے دست و پا کر کے بانہوں میں سمیٹ لیتے ہو، تم اپنے کاٹ دار مصرعوں کی تہ میں تلخ حقائق چھپا کر شہرِ پُر آشوب کا نوحہ لکھتے لکھتے زندگی اور موت کے روایتی تصورات کو یوں گڈمڈ کر دیتے ہو کہ دونوں کے درمیان حدِ فاصل کھینچنا ممکن نہ رہے۔

ایک اور بات مسعود

عورت کو تم نے اپنی بہت سی نظموں میں پینٹ کیا ہے لیکن تم نے نہ تو اُسے جل پری بنایا اور نہ ہی مقدس دیوی، تمہارے ہاں وہ ایک جیتی جاگتی عورت ہے جو زندگی کے ہر مقام پر مرد کے ساتھ ساتھ موجود ہے گو اُس کے دیگر روپ بھی تمہیں پسند ہیں مگر تمہاری حد سے بڑھی رنگین مزاجی اُسے کینوس پر محبوبہ کی صورت اُتارنا زیادہ پسند کرتی ہے، تاہم تمہاری نظموں میں وہ عصر کا استعارہ بن کر مروجہ روایات سے انحراف کرتی ہوئی بھی نظر آتی ہے، تم نے ''میں دونوں جوتوں میں اپنے پاؤں ڈالنا چاہتی ہوں'' جیسی نظم تخلیق کر کے بیٹی کے روپ کو امر کر دیا ہے اور پاکستان کی سیکورٹی اسٹیبلشمنٹ کے چہرے کی نقاب اُتار دی ہے۔

''دیوار سے لٹکا خواجہ سرا'' ایک اور اہم اظہاریہ ہے جس نے مظلوم طبقوں کے لیے تمہاری تڑپ کو زبان دی ہے، رنگین زندگی کی تہہ میں چھپی بدنمائی اور ناآسودہ جذبوں کے مدوجذر سے ابھرتا مہیب سچ انسانی معاشرت کے کھوکھلے پن کو عیاں کرتا ہے اور گھٹن کا شکار انسانی جبلتوں کے نفسیاتی عوامل سے داخلی و خارجی خلفشار کو ظاہر کرتا ہے۔

یہ نظم تم نے اپنی دوست نینا کنول کی نظم سے متاثر ہو کر لکھی ہے سو لکھتے وقت اپنا جینڈر تبدیل کر کے خواجہ سرا کا چمکیلا لباس اور کرب اوڑھ لیے ہیں۔ ادھ بجھی خواہشوں کی لپ اسٹک لگائے مردوں کو تاکتے بدچلن اور واجب القتل خواجہ سرا کو دوبارہ دیوار پر لٹکانا تمہارے کینوس کا بہت بڑا جان سوز امیج ہے، ایسی نظمیں لکھنے کے لیے دونوں گلاسوں میں ڈال کر ساری بوتل خود پینا پڑتی ہے، اور ساری رات اکیلے کرسی پہ بیٹھ کر جاگتے خوابوں کو سُلانا پڑتا ہے گویا لاشوں پہ پھول ڈالنے کے لیے اور پھولوں کو لاش بنانا پڑتا ہے۔ تمہاری بیشتر نظمیں فکری وحدت، تلازماتی بوقلمونی اور موضوعاتی تنوع کے سبب قاری کو مسحور کرتی ہیں لیکن بعض نظموں کی لامرکزیت اور تجرید قاری کی انگلی پکڑ کر زینہ زینہ نظم کے نشیب و فراز سے گزرنے کی سہولت فراہم نہیں کرتے بلکہ ان راہداریوں میں لا کھڑا کرتی ہیں جہاں آگے بڑھنے کا راستہ خود تلاش کرنا پڑتا ہے۔ ''برف کبھی بھی آگ بن

سکتی ہے''''لیچی اور خواب سے خالی درخت''''زیرِ ناف برف کی ڈلیاں''''ایوا کے چمکتے سیب ''اور کچھ دیگر نظمیں اسی رنگ میں رنگی ہیں۔

عجیب مگر دل آویز نظموں کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو کچھ مختصر نظمیں سب سے آگے کھڑی نظر آتی ہیں جن میں'' واش بیسن کی خرخراہٹ''''بارش بھرا تھیلا''''ہواؤں کا پوسٹل ایڈریس''''حبس میں پیدا ہونے والا بچہ''اور''خالی پن''شامل ہیں۔

لیکن مسعود

عندیت (Solipsism) تمہاری دنیا نہیں، جیسا کہ سب کہتے ہیں اگر ایسا ہوتا تو تم یہاں ہوتے .....اس جزیرے پر.....میرے ساتھ.....ساحلی ریت میں دھنسے ہوئے.....لیکن اس مہم جوئی کا کوئی انت نہیں.....وہ چوٹی جو تم کبھی پار نہ کر پائے، میں نے جو بوجھ سمیت سر کی ہے ..... یہاں ہر شے میسر ہے، گرم کھانا، محفوظ رہائش، چٹ پٹے ذائقے مگر انسان عقابی زندگی کی تلاش میں بہت دور نکل جاتا ہے کہ ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں آگے بڑھنا چاہتا ہے.....مگر یاد رکھو کہ لفظ جب انگڑائی لیتا ہے تو کسی کے بس میں نہیں رہتا، حسنِ ترتیب بھی اُس کی تجدید سے قاصر ہے.....وہ کسی روشنائی کا اسیر نہیں.....کوئی مخملی داؤ پیچ اسے پابند کر سکا ہے نہ چمڑے کا جکڑ بند، کھنکتی کلیدوں سے جڑا حرفِ سوال ابھی تک ہر زنبیل میں سسکتا ہے.....بے کل ہوس اسے سکوں سمیت اُچھالتی ہے تو کھلتے بدن صرف نحو کی گرہیں کھولتے ہیں۔

ایک اہم بات مسعود

تمہاری نظموں کا اچھوتا پن تمہاری منفرد سوچ اور مختلف اندازِ فکر سے اُبھرتا ہے، موضوعات پر آؤٹ آف باکس سوچنا تمہارا چلن ہے اور یہی وہ سورس ہے جو تمہاری تخلیقی رنگارنگی کو جلا بخشتا ہے۔

''تو میرے دماغ کے دائیں کونے میں رہتی ہے'' جیسی نظمیں تخلیق کر کے تم نے سب کو حیران کر دیا ہے، سو اس نظم پر بالخصوص وہ سب کہنے کی اجازت دو جو میں تمہاری کئی نظموں کے بارے میں کہنا چاہتی ہوں لیکن بہ وجہ کہنے سے گریزاں ہوں۔

مسعود!

اس نظم میں تمہارا کئی جہات کا حامل اندازِ فکر اُبھر کر سامنے آیا ہے، انسانی دماغ کو دو حصوں

میں بانٹ کر اس کی حرکیات کا تجربہ کرنے والی یہ تھیوری گو پرانی ہے اور اسے بعض نئی ریسرچوں نے تبدیل کر دیا ہے، خصوصاً ریٹا کارٹر کی کتاب ''میپنگ آف مائنڈ'' اس ضمن میں نئے افق تراش چکی ہے لیکن تم نے اپنے شاعرانہ استدلال کو ماضی سے مربوط و ہم آہنگ کر کے اپنے تخلیقی تنوع کے دائرے کھینچے ہیں۔ یقیناً یہ ہر تخلیق کار کا حق ہے کہ وہ اپنے ہنر کو اپنے منفرد انداز سے برتے کہ اس کا فن پارہ دوسروں سے نمایاں اور الگ نظر آئے سو اس میں تم نے بھی دماغ کے دائیں حصے کو امر کیا ہے اور اپنی تخلیقات کو زندہ جاوید فن پارہ بنانے کی سعی کی ہے، یاد رہے کہ دماغ کا دایاں حصہ ہی عملِ تخلیق سے جُڑا ہے اور یہی عملی لحاظ سے جسم کے بائیں بازو کی قوتِ نافذہ ہے، یوں تم نے کمیونزم کے ساتھ اپنی وابستگی کو بھی اُجاگر کیا ہے۔

مسعود

تم نے اپنی اس نظم کے ذریعے ''خلاقیت'' اور ''دریافت'' پر ہونے والی اس بحث کو ایک بار پھر چھیڑا ہے، جس کا آغاز قدیم یونانی، چینی اور انڈین مفکرین نے اپنے اپنے ادوار میں کیا تھا۔ یہ مفکرین فنونِ لطیفہ اور اس کی مختلف اقسام کو Discovery قرار دیتے ہیں کریٹو ایٹی نہیں، قدیم یونانی مفکرین اس ضمن میں جو اصلاحات استعمال کرتے ہیں ان میں ایک اصلاح

Poiein (to make), which only applied to poiesis (poetry)and to the poietes(poet,or maker) who made it.

So Plato didn,t believe in art as a form of creation Asked in The Republic,, will we say of a painter that he makes something?, he answers certainly not , he merely imitates-

میرے نقطہ نظر کے مطابق فنونِ لطیفہ اور شاعری کو عرصہ دراز تک مفکرین نے خلاقیت قرار نہیں دیا اور اسے یا تو Discory اور ہنرمندی کے کھاتے میں ڈالے رکھا یا پھر اسے نوائے سروش قرار دے کر عطائے خُداوندی کہا یہ تو غالباً نشاۃ ثانیہ کی یورپی تحریک کا اعجاز ہے کہ اسے حضرتِ انسان کے ذہنِ رسا کی خلاقیت قرار دیا گیا اور عطائے خُداوندی کے فلسفے کو رد کر کے اسے انسان یا فرد کی اچیومنٹ تصور کیا گیا شاید اُسی فکر کی کوکھ سے پولی میتھ کا ہیولا اُبھرا۔ پولی میتھ ایک

ایسا فرد جو ہیومنزم کے ارفع تصورات سے لیس ہونے کے ساتھ ساتھ علم وتخلیق کا منبع بھی ہے۔ لیو نارڈوی ونسی کو اس کی عملی تجسیم بھی قرار دیا گیا۔ یہ تبدیلی دھیرے دھیرے نمو پذیر ہوئی تھی لیکن حتمی طور پہ اینلائٹمنٹ (Enlightlenment) ایج آف ریزن کے دور میں ظاہر ہوئی۔ اٹھارویں صدی کو ہم عصر روشن خیال گردانتے ہیں، اسی زمانے میں تخیل کو ادراک کا جزو لاینفک قرار دیا گیا اور ایستھیٹکس میں کریٹیوٹی کی بات کی جانے لگی۔ ولیم ڈف شاید پہلا فلسفی تھا جس نے تخیل، کریٹیوٹی اور ادراک کی اعلا ترین ضرورتوں کو جینیس کی میراث کہا، لیکن خلاقی کو براہ راست سنجیدہ مطالعہ بنانے کا سہرا انیسویں صدی کے البرٹ رنکو (Albert rinko) کے سر ہے یوں اس صدی کے اواخر تک اس کے باقاعدہ سائنسی، نفسیاتی اور سماجی مطالعہ پر فوکس بڑھا اور پھر بعد ازاں پوئن کیری اور ہیلمو ہولٹز اس کے معتبر نقیب بنے اور ''ورک آف تھاٹس'' 1926 میں شائع ہوئی اور اس تصنیف کو کریٹیو پراسس کا پہلا ماڈل کہا گیا۔ گوتم نے بڑی چابک دستی سے کئی مباحث کے تھریڈز اس نظم میں ڈالے ہیں جس میں ''خُدا کی موت'' یا خلاقی سے اس کے ناتے کو مکمل طور پر توڑنا، تخلیق کے نفسیاتی پیرائے اور درجہ بندیاں، مائنڈ کی میپنگ اور لوبز کی لسانی اور فکری ڈائنامکس پر گفتگو کے لیے دفتر رقم کرنا پڑیں گے جو اس نظم کے شاعرانہ لطف ونشاط سے قاری کو بہت دور لے جائے گا سو میں اس نظم کو اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ قرار دینے پر ہی اکتفا کرتی ہوں۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے درحقیقت تم بلا کے پیراڈوکسیے ہو.....

فطرت سوہان

وجودیت اور ترقی پسندی کے خمیر سے اُٹھا ''بارش بھرا تھیلا''

مسعود قمر سویڈن میں مقیم اُردو نظم کے شاعر ہیں۔ان کا آبائی شہر لائل پور ہے۔ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''سوکھی گھاس کا نظم پڑھنے سے انکار'' (۲۰۱۱) میں منظر عام پر آیا۔ان کی نظموں کے دو مجموعے ''قہقہہ انسان نے ایجاد کیا'' (۲۰۱۲) اور ''کاغذ پہ بنی دھوپ'' (۲۰۱۵) میں شائع ہوئے، یہ دونوں مجموعے اس لحاظ سے اُردو شاعری میں پہلا تجربہ ہے کہ ان کی نظمیں کسی ایک شاعر کی تخلیق نہیں بلکہ یہ تمام نظمیں تین شاعروں مسعود قمر، حسین عابد اور جاوید انور کی مشترکہ تخلیقی کاوش کا نتیجہ ہیں۔لائیو ویڈیو محفلوں میں تخلیق پانے والی ان نظموں میں ایک مصرعہ کسی ایک شاعر کا ہے تو دوسرا مصرعہ یا بند کسی دوسرے شاعر کا ہے۔اس طرح نظموں کے دونوں مجموعے باہمی تخلیقی اشتراک کا نتیجہ ہیں۔

مسعود قمر کی تازہ تخلیق ''بارش بھرا تھیلا'' کا انتساب بھی مختصر نظم کی صورت ہے:

''اُس چہرے کے نام
جس نے کہا
کتاب میں میرا چہرہ نہ دکھانا''

مسعود قمر کی نظمیں وجودی فلسفے سے متاثر نظر آتی ہیں۔وجودیت فلسفیانہ سطح پر انسانی وجود کے سوال کا جواب تلاش کرنے کی جستجو ہے۔اس نظریہ میں انسان کا انفرادی وجود اہمیت رکھتا ہے۔وجودی مفکرین انسانی وجود کی اہمیت وعظمت کا احساس جگانے کے لیے فرد کی آزادی کو اولین شرط قرار دیتے ہیں، یوں ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، انتخاب کی اس آزادی اور ذمہ داری سے ہی فرد ذہنی اضطراب کا شکار ہو گیا، اس آزادیِ انتخاب کے باوجود فرد اپنے انجام کو نہیں

جانتا،اس کا عمل زمان ومکان کے دائرے میں مقید ہے،اس لیے وجودی ادیبوں کی تحریروں میں لایعنیت کے مظاہر جابجا ملتے ہیں۔البرٹ کامیو کے معروف ناول(۱۹۴۰)''The Stranger'' کا مرکزی کردار مرسو اپنی ماں کی وفات پر بھی جذبات سے عاری رہتا ہے،اسی شام عیاشی کرتا ہے پھر کسی کو قتل کرنے کے بعد جیل جاتا ہے اور اسی عدم جذبات کے ساتھ موت کا انتظار کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کی موت کی سزا پر عمل درآمد ہو جاتا ہے،اسی طرح دوستوفسکی کے ناول (1864) ''Notes from the under ground And the gambler'' میں لایعنیت کے نتیجے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ بے عملی ہی اعلیٰ ذہانت کا اولین مظہر ہے،اسی لایعنیت کے نتیجے میں انسان کو تباہی اور موت کا سامنا ہے۔موت کی المناکی وجودیت کا ایک نمایاں موضوع بلکہ وجودیت کے عناصرِ ترکیبی میں سے ہے۔مسعود قمر کی نظم میں وجودیت کو آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔

''وہ جو موت لکھوا کر آتے ہیں
ساری زندگی
موت کو چھونے کی جدوجہد میں
لگے رہتے ہیں
ہم
موت سے پوچھے بغیر پیدا ہوئے''[نظم ساحل پہ پڑا گیلا لباس]

''پیدائش
صرف موت کا ذائقہ چکھنے کے لیے ایجاد ہوئی
ہم چٹخورے باز ہو گئے
اور پیدا ہونا بھول گئے
ہمیں موت کا اتنا چٹخارہ لگ گیا
کہ
ہم پیدا ہوئے بغیر ہی مرنے لگے''(نظم چٹخورے باز)
موت کی پیدائش

زندگی سے خالی ہوتی ہے
میری پیدائش
موت کو مار کر ہوئی
موت کی دھن پر
پیدائش کا رقص نہیں کیا جا سکتا'' (نظم پیدائش سے پہلے لکھا گیا گیت)

''میری پیدائش
قبر میں ہوئی
میں چھلانگ لگا کے زندگی سے ملا ہوں
میں
قبر کو ہمیش کے لیے قبر میں دفن کر آیا ہوں'' (نظم قبر کی موت)

انسانی وجود کے معنی اور اہمیت کی دریافت وجودیت کا جوہر ہے۔ وجود کی تلاش ذات یا اثباتِ ذات مسعود قمر کی نظموں میں بھی نمایاں ہے

''سارے رستے
شہر کی طرف جاتے ہیں
نیکی اور بدی کی طرف
مجھے تو خود تک پہنچنا ہے
میں خود سے باہر کیسے نکلوں
خود تک پہنچوں
باہر تو سارے رستے
نیکی اور بدی کی طرف جاتے ہیں'' (نظم تلاشِ ذات)

موجودہ دور میں سائنس کی بے پناہ ترقی کے باعث مشینی تہذیب پیدا ہو گئی ہے، جس سے ایک طرف سہولت اور تعیشات کی بھرمار تو ہوئی لیکن دوسری طرف انسانی بقا اور تحفظ کا سوال بھی کھڑا ہو گیا ہے۔ اس تہذیب کی بڑی خامی یہ ہے کہ انسان مشینوں کا غلام اور دوسرے انسان

کے لیے اجنبی بن گیا ہے،انسانی رشتوں کی کڑیاں منتشر ہوگئی ہیں ،اس صورت کو بیگانگی کہتے ہیں۔بیگانگی کی اصطلاح موجودہ ترقی یافتہ دور کی دین ہے جس میں مشینوں کی حکومت نے اور سائنس کی ترقی کی وجہ سے ملنے والی آسائشوں نے انسانوں کو ایک دوسرے سے بہت دور کر دیا ہے۔انسان ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی دور ہے اور ہجوم میں بھی تنہا ہے، اس کے پاس اپنے لیے بھی وقت نہیں ہے۔یہ صورت حال تنہائی کو جنم دیتی ہے،اس دور کا انسان تمام نام نہاد خوشیوں کے باوجود تنہائی کا شکار ہے۔تنہائی کا یہ احساس مسعود قمر کے ہاں بھی بہت گہرا ہے۔

''موت کے بعد زندہ رہنا
موت کی اذیت ناک تنہائی ہے
موت
زندگی کی تنہائی سے
نجات دلاتی ہے
مگر موت کی تنہائی سے
نجات کون دلائے گا''(نظم موت کی تنہائی)

''بک شیلف میں پڑی
خاموش کتابوں کا شور
جیب میں پڑی
قربتوں کی ریزگاری کا شور
فون کی خامشی کا شور
شور کی بارش اتنی تیز تھی
اکلاپا میرے دیکھتے دیکھتے بہہ گیا''(نظم اکلاپا سے محروم شخص)

اس تنہائی اور مشینی زندگی سے اُکتا کر خودکشی کرنے کی خواہش بھی مسعود قمر کے ہاں نظر آتی ہے۔

''میں نے

خودکشی کرنے کے لیے
گھر میں ایک دریا بنایا ہے'' [نظم واش بیسن کی خرخراہٹ]

''مجھے
پیدائش کے لیے
خودکشی کرنی پڑے گی
میں
موت سے تنگ آ گیا ہوں'' (نظم موت سے اُکتاہٹ)

اسی تنہائی اور اکلاپے کے نتیجے میں عصرِ حاضر کا انسان تجدیدیت، ایبسر ڈٹی یا لایعنیت کا بھی شکار ہے۔ لایعنیت جدید نظم میں مرکزی رجحان کی حیثیت سے موجود ہے۔ ان نظموں سے حظ کشید کرنے کے لیے قاری کو اندرونِ ذات صلاحیتوں کو کام میں لانا پڑتا ہے۔

مسعود قمر کی نظمیں بھی تجرید، لایعنیت اور ابہام کے امتزاج سے خلق ہوتی ہیں۔ تخلیقی سطح پر ان میں جو سوالات اُٹھائے گئے ہیں وہ حالات اور سماج کی کج روی اور ناہمواری سے متعلق ہیں جو پیچیدہ بھی ہیں اور بے ساختہ بھی۔

''میں نے اُسے وہاں وہاں ڈھونڈا
جہاں جہاں اس نے نہیں ہونا تھا
میں بھی اب کہیں نہیں ہوں
میں نے خود کو وہاں وہاں ڈھونڈا
جہاں جہاں میں نے نہیں ہونا تھا'' (نظم فضاؤں میں لکھا گیا پوسٹل ایڈریس)

''میں آنکھیں بند کر کے
Anton Bruckner کو سُننے لگا
جس کی دھن جذبوں کو جگاتی ہے
اور
اُسکی یاد کو تمہارے سامنے کرسی پہ بٹھا دیتی ہے
جو کبھی تھی ہی نہیں'' (نظم سکّوں کے بغیر پنسلیں)

وجودیت کے ساتھ ساتھ ان کی نظمیں ترقی پسندی کے خمیر سے اُٹھی ہیں۔ترقی پسندی کی بنیاد اشتراکیت پر ہے، ترقی پسند نظریہ ادب دراصل اس فکر کی تخلیقی و جمالیاتی توسیع ہے جو سماجی اور معاشی سطح پر ٹھوس سائنسی مظہر کا حامل ہے۔ترقی پسند فرد کے بجائے جماعت اور ماورائیت کی بجائے حقیقت کو ترجیح دیتے ہیں، ان کی ہمدردیاں سرمایہ دار کی بجائے مزدور اور ظالم کی بجائے مظلوم کے ساتھ ہیں۔ترقی پسندوں نے مقہور، مظلوم، بے سہارا اور دبے ہوئے افراد کی حمایت کی ہے۔

مسعود قمر اپنی نظموں میں ہر طرح کے ظلم و استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، اور عصرِ حاضر کی سچائیوں کو اپنی نظموں میں سموتے ہیں۔مسنگ پرسن (Missing Person) کی بیٹی سے گفتگو کے بعد ایک نظم

''بابا کی ایک عینک کی آنکھ
گھر کی دہلیز کے باہر پڑی ہے
دوسری ٹارچر سیل کی دہلیز کے اندر
میں
بابا کی دونوں آنکھوں کو
ایک ساتھ چومنا چاہتی ہوں''

نظم کا اختتام کربناک الفاظ پہ ہوتا ہے

''میں
بابا کی آنکھیں، ماتھا، رخسار
ہاتھ اور ہونٹوں کو
چومنا چاہتی ہوں
چاہے وہ مسخ شدہ ہی کیوں نہ ہوں'' (نظم مسنگ پرسن کی بیٹی سے گفتگو)

دیس میں گیس کی کمی وجہ سے مہرباں ریاست نے اچھی کوالٹی کے کوئلوں کی بوریاں لوگوں میں مفت بانٹ دی ہیں، اور ان کوئلوں کے بارے میں مسعود قمر کہتے ہیں

''یہ کوئلے

اُن لوگوں کے جلنے سے بنے ہیں
جنہوں نے اپنی پسند کی شادیاں کیں
اور
ریاستی مذہب کو
سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا'' (نظم اچھی کوالٹی کے کوئلے)

اہل اقتدار کی نااہلیوں، ہوس، ریشہ دوانیوں اور اپنے مفاد کو مفادِ عامہ پر ترجیح دینے کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں:

''شہر کے جنگلات کہاں گئے؟
وزیرِ جنگلات نے کٹوا دیئے
شہر کے باغات کہاں گئے؟
وزیرِ تعمیرات نے
ان میں پلازے اُگا دیئے
شہر کے سکول کہاں گئے؟
وزیرِ جیل نے اُن میں
بیرکیں بنوا دیں
شہر کے طالب علم کہاں گئے؟
جیلوں میں بیٹھے انقلابی گیت
نیفوں میں چھپانے کی مشق کر رہے ہیں
شہر کے مجرم کہاں گئے؟
اقتدار کے ایوانوں کی رونق بنے
شہر کے تھیٹر اور سینما کہاں گئے؟
آڑھت کی منڈیوں میں تبدیل ہوئے'' (نظم شہر کی لڑکیاں کس کونے میں ہیں)

اس کے علاوہ نظم ''ماں جیسی ریاست'' بھی ریاست کے تشدد پسند رویوں پر طنز ہے۔

ترقی پسندوں نے رجعت پسندی، تشدد اور آمریت کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ اس لیے ترقی پسند

ادب ہمیشہ زیرِ عتاب رہا ہے اوران کے مصنف قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ مسعود قمر کی نظموں میں حق کہنے والوں بالخصوص ادیبوں اور سچ لکھنے کی پاداش میں ہونے والے ظلم و جبر اور تشدد جا بجا نظر آتا ہے اور اسی ظلم اور تشدد کے خلاف مزاحمت بھی ان کی نظموں میں نمایاں ہے۔ چند نظمیں ملاحظہ ہوں۔

''جب
میری آنکھوں پہ پٹی
باندھ کر سیاہ رات کی
تو سارا بندی خانہ سفید کبوتر کے پَر بن گیا
جب انہوں نے میرا
پہلا ناخن اکھاڑا
تو درد مجھ سے کوسوں دور تھا
جب انہوں نے میری زبان
کاٹ کر لٹکتے چھوڑ دی
تو میرے اندر
لفظ گنگنانے لگے
مگر
جب جلاد تحقیقاتی کمیشن کا سربراہ بنا
اور
لوگوں نے انصاف کے ترازو میں
پڑے باٹ کے ہار
جلاد کے گلے میں ڈالے
تو.........میری موت واقع ہوگئی'' [نظم انصاف نامی قبرستان ے ایک مجرم کی قبر]

مسعود قمر کے مطابق سچ کہنے والے مر کر بھی امر ہو جاتے ہیں، دو نظموں کے چند حصے ملاحظہ کریں۔

''میری نظمیں مجھ سے پہلے
پھانسی گھاٹ پہنچ کر
پھندے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں
اور میری گردن
کبھی لمبی نہیں ہوتی'' (نظم قبر کی موت)

''لڑکی
ہر پیشی پر
پونے میں بندھی روٹی کے نیچے
قیدی کے لیے
نظم چھپا کے لاتی ہے
جسے قیدی روٹی کے ساتھ نگل جاتا
رات اُلٹا لٹکائے جانے پر
قیدی ساری خوراک اُگل دیتا
سوائے نظم کے'' (نظم برف کے اندر پڑی نظم کی گرمائش)

حقیقت اور سچائی کا بیان اور اس کی عکاسی ترقی پسند ادب کا خاصہ ہے۔ مسعود قمر کی نظمیں حقیقت کی بے رحم عکاس ہیں، ان کا تخلیقی شعور سماجی ماحول سے مربوط ہے۔ ان نظموں میں ظالم اور جابر حکمران کے خلاف آواز بلند کرنے کے ساتھ ساتھ جدید دور کے انسان کی بے حسی پر بھی افسوس اور ملال موجود ہے۔ ان کی نظموں نے اطراف میں پھیلی ہوئی حقیقتوں کو کامیابی کے ساتھ نظموں کا پیرہن عطا کیا ہے۔

''جہاز چیختے ہیں
اور
دنیا کانوں پر ایم پی تھری لگائے محوِ رقص ہے
کوڑا کرکٹ پر گدھ بچوں کو نوچ رہے ہیں
مگر

کمپنیاں صاف ستھرے گوشت کو
پیکٹوں میں محفوظ کرنے کے نئے نئے
طریقے سوچ رہی ہیں'' (نظم چھاتیوں سے محروم مائیں)

وہ حادثات اور سانحات اور ان پر ہمارے ردِعمل کو بھی شدید طنز کا نشانہ بناتے ہیں، اس حوالے سے ان کی ایک نظم'' ہم پیشہ ور سوگوار ہیں'' ایک نمائندہ نظم ہے، جس میں چھوٹے چھوٹے حادثات سے لے کر بڑے سانحات پر ہماری قوم کے ردِعمل یا دوسرے معنوں میں بے حسی کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔

''اگر کوئی حادثہ ہو جائے
جو لوگوں کی برداشت سے باہر ہو جائے
تو
ہم سڑکوں پہ لگے کھمبے اُکھاڑ کر
کلاشنکوف سے نکالے خون سے
سڑکوں پہ سوگ تحریر کر دیتے ہیں
اور بعض دفعہ
سوگ منانے کے لیے
انسانوں کو بھی جلانا پڑتا ہے (نظم ہم پیشہ ور سوگوار ہیں)

مسعود قمر کی نظمیں معاشرتی حبس اور گھٹن کی شدید مذمتی ہیں، وہ ہر قسم کے ظلم و استحصال سے پاک آزاد معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں، جس میں صنفی امتیازات نہ ہوں، روشن خیالی اور مساوات ہو:

''سارے گھر
کھڑکیوں اور روشن دانوں کے بغیر بن رہے ہیں
دروازے کھلے بھی ہوں
تو
ان کے کنڈوں میں

غیرت اور عقیدوں کے وزنی تالے لٹکے رہتے ہیں
لڑکیاں برقعوں کو سیج پہ لٹا کر
دیوار پہ چاک سے
روشن دان بنانے میں جُتی ہوئی ہیں
برقعے پیدائش کے
اور لڑکیاں
دیوار پہ روشن دان بننے کی منتظر ہیں'' (نظم حاملہ برقعے)

ترقی پسندی کی بنیاد سائنسی عقلیت پر ہے ان کے نزدیک مذہب اور توہمات افیون ہیں، اس لیے ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات میں مذہب سے دوری نمایاں ہے، مسعود قمر کی نظموں کے کچھ حصے اس رجحان کی عمدہ عکاس ہیں:

''دائیں کونے کے انسان نے
اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے
خُدا کو ایجاد کیا
مگر
خُدا اپنے تخلیق کار کو چھوڑ کر
اپنی پوجا کروانے کے لیے
دماغ کے بائیں کونے میں چلا گیا'' [نظم تو میرے دماغ کے دائیں کونے میں رہتی ہے۔

''سنو
میرے دماغ کا
صرف اور صرف ایک ہی کونہ
میلی کر دے گا، تمہاری گول گول سفید ٹوپیاں
اور بے وزن کر دے گا
تمہارے پتھر اور تمہاری مناجاتیں'' (نظم میلی ٹوپیاں)

نظم ''خُدا اور فوٹو گرافر'' میں ہر طرف پھیلی خون کی ہولی اور شدت پسندی کو موضوع بنایا

گیا ہے۔

بچوں سے لے کر بوڑھوں تک ہر ایک پہ ظلم اور ستم ہو رہا ہے لیکن خُدا خاموش ہے نظم کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے:

''انہیں مت دیکھو
کہ ظلم ہوتے دیکھنا
صرف اور صرف
خُدا اور فوٹو گرافر کو ہی زیب دیتا ہے'' (نظم خُدا اور فوٹو گرافر)

اس کے مقابلے میں مسعود قمر کی نظمیں محبت، امن اور انسان دوستی (ہیومنزم) کی علم بردار ہیں۔ نظم ''محبت کی سرسوں'' ان جذبات کی نمائندہ نظم ہے، جس میں وہ بہت سی ایسی ملالہ اور اعتزاز کی خواہش کرتے ہیں، جو بچوں کو خودکش بمباروں سے بچا کر ان کے گلے میں کتابوں کے بستے ڈال سکیں۔ ان پاؤں کو کاٹ ڈالنا ہے جو انسانی سروں سے فٹبال کھیلتے ہیں۔

اور ان ججوں کے سروں سے سفید وگیں بھی اُتارنی ہیں جو انہوں نے درندوں کی وکالت کے صلے میں سروں پر سجائی ہیں۔

نظم کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے:

''ہمیں
اُگانی ہے اس سرزمین پر
محبت کی سرسوں
اور
اُگانے ہیں اس زمین پر
بہت سے انسانی رنگت کے گلاب'' (نظم محبت کی سرسوں)

مسعود قمر کی نظموں میں بہتر مستقبل کا خواب اور امید ہے، وہ حالات سے نا اُمید بالکل نہیں ہیں۔

''زنگ آلود تالے میں اگر
درخت کی شاخیں اُگ آئیں

تو تالا کبھی مقفل نہیں رہتا'' (نظم زنگ آلودہ تالے میں اُگا درخت)

''پھولوں کے باغ میں
چھاؤنی بنانے والے بھول جاتے ہیں
پھول چھاؤنی کی دیوار
پھاڑ کر اُگ آتا ہے'' (نظم نظموں بھرا تکیہ)

مسعود قمر خواب دیکھتے ہیں ان کی نظمیں خوابوں سے اٹی پڑی ہیں۔ خوابوں کی فراوانی نظموں کے مصرعوں کی ساتھ ساتھ نظموں کے عنوانات میں بھی ہے۔ خوابوں سے بھرپور چند نظموں کے عنوان کچھ یوں ہیں'' خواب کے ساتھ بندھا شخص، بغیر معاوضہ لیے پہلا دیکھا گیا خواب، خواب دیکھتے جگنو، خواب میں چیختا چلاتا کمینگی ہے، خواب بن جانے کا خواب، توہینِ خواب محبت، جاگتے خوابوں کو سُلانا'' مسعود قمر کے ہاں خواب ایبسٹریکٹ نہیں ہیں بلکہ یہ وجود رکھتے ہیں۔

''برف، گھاس، چاند اور میں
خواب کے ساتھ
ہولے ہولے جھول رہے ہیں'' (نظم خواب کے ساتھ بندھا شخص)

''رات کا دو بجا ہے
خواب رستہ روکے کھڑا ہے
میں
نیند کی خفیہ پگڈنڈیاں ڈھونڈ رہا ہوں
میں آج تک خالص نیند نہیں سو سکا
اُس عورت نے
میری نیند میں ملاوٹ کر دی ہے
میں خوابوں سے کیسے نکلوں
نیند تک پہنچ پاؤں'' (نظم نیند کی خفیہ پگڈنڈیاں)

مسعود قمر کے نزدیک خواب بہت ضروری ہیں، یہاں تک کہ وہ خوابوں کے بغیر نیند کو

لاش کے بغیر تابوت کی مانند قرار دیتے ہیں۔

''قبروں میں کچھ تابوت
لاشوں کے بغیر دفن ہیں
لوگ ساری زندگی
خوابوں سے خالی
نیند لیتے ہیں'' (نظم خالی پن)

''اس سے پہلے
دن ہمیں بھسم کر ڈالے
آؤ
ہم خواب بن جائیں'' (نظم خواب بن جانے کا خواب)

مسعود قمر کی نظم میں وجودیت، تجدیدیت، مغائرت اور ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ رومانیت بھی ہے بلکہ بہت بھرپور ہے وہ تقاضہِ زندگی اور تقاضہِ دل دونوں کے نظم نگار ہیں۔ان کی شاعری میں فلسفہ وحقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ عشق کی سرمستی وسرشاری ہے، محبت کی رنگینی ہے، ہجر ووصال، رنگ خوشبو اور سیب فروخت کرتی ایوا بھی ہے۔

''مجھے
جتنی محبتیں ملیں
ہجر کے وصال میں ملیں

ہجر کی کالی بلی
میری بک شیلف، فیروزی سکارف
میرے بستر، سرخ وائین اور وہسکی کے گلاسوں میں بیٹھی
مجھ پہ میاؤں میاؤں کرتی رہتی ہے'' (نظم نظموں کا جیب کُترا)

جوانی میں غمِ روزگار اور دن رات سیاست میں مصروف رہنے کی بنا پہ محبت سے دور رہنے کا ملال بھی ہے اور محبت پانے کی

خواہش بھی۔

''جب لڑکی
سیب اور انار خرید رہی تھی
ہم مصروف رہے
سائیکل مرمت کرانے میں
آڑھت منڈی میں
دوکان حاصل کرنے میں

اور اب
کمینگی کی حد تک
ڈھونڈتے پھرتے ہیں دوکانوں پہ
ریڈی میڈ محبت
مگر
وقت کے چالاک درزی نے
ہماری ناپ والے کاغذ پہ
سموسے کھا کر اُسے کہیں پھینک دیا ہے'' [نظم کاغذ کا ناپ]

''اگر
مجھے پتا چل جائے
پھانسی کتنے وقت کے لیے ملتوی کی گئی ہے
میں اُس لڑکی سے
ایک بار اور محبت کرلوں'' [نظم درمیانی وقت میں محبت کی خواہش]

''میں
جب بھی سمندر کو دیکھتا ہوں
وہ لڑکی

سمندر اور میرے درمیان
آ کے کھڑی ہو جاتی ہے
اور
میں فیصلہ نہیں کر پاتا
میں دونوں میں سے کس کے اندر نہاؤں' (نظم کنارے پہ کھڑا سوکھا آدمی)

مسعود قمر کی نظم کی بنیاد احساسات اور محسوسات پر ہے جو انسانی فطرت کا لازمی جز ہے۔ ان کی شاعری کا انحصار داخلی اور خارجی دونوں عوامل پر ہے، وہ تخیل کی کارفرمائی اور زبان کے چٹخارے تک قاری کو محدود نہیں رکھتے بلکہ انہیں دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔

ان کی تخلیقی شعور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مرکز سے علیحدہ ہوئے بغیر ایسے تہذیبی، سیاسی اور سماجی مسائل کی نشاندہی کر رہے ہیں جو رفتہ رفتہ عالمگیر مسائل بنتے جا رہے ہیں۔ ہمارا اجتماعی شعور، وجدان، زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کی طرف ہمارا رویہ غرض یہ کہ ان کی نظم میں زندگی کے تمام تجربات کو ایک عالمگیر سچائی میں منتقل کر دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔

ان کے ہاں ترقی پسندی یا انسان دوستی کا جو جذبہ ملتا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ان کا ذہن مشرق و مغرب اور ماضی و حال سے یکساں مستفید ہوتا ہے۔ یہی وہ پس منظر ہیں جس میں ان کی نظمیں اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور ادبی اقدار متعین کرتے ہوئے اپنی معنویت ہم پر واضح کرتی ہیں۔

ڈاکٹر سمیرا اکبر
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

اکو حرف تیرے درکار

مجھے لگتا ہے مسعود قمر کی شاعری چار بنیادی ستونوں پہ قائم ہے۔ کہاں سے شروع کیا جائے، چلیے شاعر کے بچپنے سے شاعر کی جنم بھومی سے شروع کرتے ہیں۔ اُس نے کہا

''شہر کی لڑکیاں کس کونے میں ہیں
دادیاں نانیاں بنیں
محبت کی شادیاں رکوا رہی ہیں''

اُس نے سوال اُٹھایا

''شہر کے تھیٹر اور سینما گھر کہاں گئے؟
آڑھت کی منڈیوں میں تبدیل گئے
(نظم شہر کی لڑکیاں کس کونے میں ہیں)

آڑھت کے بین السطور مطلب پر زور دیے بغیر بھی یہ سوال و جواب معاشرتی جمود، سماجی بوسیدگی کے ساتھ ساتھ صارفیت کے ایک نئے کلچر کی خبر دیتے ہیں۔

لائل پور کے کسی رہائشی کے لیے یہ مناظر روزمرہ کا معمول ہیں، بالخصوص اس باسی کے لیے جس نے اپنے لائل پور کو فیصل آباد بنتے دیکھا ہو، مگر وقت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اب یہ کہانی صرف لائل پور تک محدود نہیں رہی ایک کے بعد دوسرا شہر یہی کہانی دہرائے چلا جا رہا ہے۔

شاعر نے کہا

''جب لڑکی
سیب اور انار خرید رہی تھی

ہم مصروف رہے
سائیکل مرمت کرانے میں
آڑھت منڈی میں
دوکان حاصل کرنے میں
ماہِ رمضان میں کمائی گئی وکری
دس بار گننے کے بعد ایک بار اور گننے میں

.....

اور اب ڈھونڈتے پھرتے ہیں
ریڈی میڈ محبت'' (نظم کاغذ کا ناپ)
ایک اور نظم میں اُس نے کہا
''لوگ محبت کرتے کرتے
کام کرنے لگ جاتے ہیں
مکان تعمیر کرانے لگ جاتے ہیں''
(نظم ایک ٹانگ پہ کھڑی محبت)

آپ خود ہی بتایئے اس کے بعد کیا یہ سوال عین فطری ہے یا نہیں
''تم ہر وقت بیویاں کیوں بنی رہتی ہو'' (نظم گلاب جامن بھرے سموسے)
میں گواہی دیتا ہوں کہ شاعر ۸۰ کی دہائی کی اوائل میں بھی سماجی صورت حال سے ہی نہیں جابرانہ سیاسی ماحول سے بھی ناخوش تھا، صرف ناخوش ہی نہیں اس نے جمود کو توڑنے کی کاوش بھی کی تھی۔ آزادیِ صحافت کی تحریک کے دوران گرفتاری ایک بار نہیں تین بار دی تھی، سندھ سے صوبہ بدری کے احکامات توڑے، فوجی عدالت میں جج کی کرسی پر براجمان کرنل کو جج تسلیم کرنے سے انکار کیا، منہ بھر کر نہ صرف گالی دی عدالت پہ تھوکا بھی، اسی لیے سب صحافیوں سے زیادہ سزا کاٹی۔

مجھے مسعود قمر کے اپنے منہ سے جیل میں گزری زندگی کی تفصیلی روداد سُننے کا اتفاق نہیں

ہوا مگر ریاستی اداروں کے ہاتھوں قیدیوں کی زبوں حالی اور انسانی حقوق کی پامالی کا نقش کم وبیش چالیس برس گزرنے کی بعد بھی شاعر کے ذہن میں دھندلا نہیں ہو پایا۔

اُس نے کہا
''ادھ بجھے سگرٹوں سے
ہمارے جسموں پہ نقش و نگار بنائے گئے'' (نظم جعلی نکاح ناموں پہ خُدا کے دستخط)

پھر لکھا

''جب اُنہوں نے میرے
بائیں ہاتھ پہ عمر کی لکیر پہ میخ ٹھونکی
تو
میں نے اپنا نام
عمرِ جاوداں رکھا
مگر
جلاد جب تحقیقاتی کمیشن کا سربراہ بنا
اور
لوگوں نے انصاف کے ترازو میں
پڑے باٹ کے ہار
جلاد کے گلے میں ڈالے
تو میری موت واقع ہوگئی'' (نظم انصاف نامی قبر)

اسی بنا پر لاپتہ کر دیے جانے والے ''مسنگ پرسن'' کی حمایت میں لکھی جانے والی تین شاندار نظمیں (''برفیلی سُرنگ کی قیدی''.....''ہم بہت ہیں''۔''دونوں جوتوں میں پاؤں'') بلاوجہ نہیں لکھی گئیں۔

ضیائی دور میں اسلام اور اسلامی کلچر کے فروغ کے نام پر جو ناٹک کھیلا گیا اس کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں مگر نام نہاد اسلامی پارٹی کی ملی بھگت سے سرانجام دیئے گئے مکروہ جرائم کے اثرات آج جا بجا بکھرے دکھائی دیتے ہیں، یوں سمجھ لیجیے۔

''ججوں نے سفید وگیں اُتار کر
سفید گول ٹوپیاں پہن لیں'' (نظم برفیلی سُرنگ کی قیدی)

اور

''نالے میں جنسی جرثومے
میرے بدن میں پستان ڈھونڈتے رہتے ہیں'' [نظم ماں جیسی ریاست]

یہ تو تھے فوجی آمر کی حکمرانی کے سیاسی مضمرات، آیئے ایک بار پھر سماجی پہلو کی طرف لوٹتے ہیں۔ شاعر نے سیاسی خیانت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نسلوں کی کہانی یوں بیان کی ہے

''نقشہ نویس نے
پھولوں کا باغ، قبرستان
اور دولہن کا گھر ساتھ ساتھ بنائے'' (نظم ہنی مون مناتے گدھ)

مزید براں

''چھوٹا موٹا سوگ تو ہم
ریلوے اسٹیشن پہ کھڑے کھڑے
بھری بس میں چڑھتے چڑھتے
اور رش میں جیب کُتری کرتے کرتے منا لیتے ہیں'' (ہم پیشہ ور سوگوار ہیں)

یہ مذکورہ نظم یقیناً گلزار کی کہانی رودالی سے متاثر لگتی ہے (نوٹ میں نے گلزار جی کی یہ کہانی آج تک نہیں پڑھی مسعود قمر) لیکن مسعود قمر نے عزاداری کے پیشے کو امراء کی میتوں پر کی جانے والی گریہ زاری تک محدود نہیں رہنے دیا، اسے ایک عام معاشرتی چلن قرار دیا ہے۔ اس منافقت کو پھلتے پھولتے بالخصوص میڈیا میں سرایت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

اُس نے لکھا ''ایسے موسم میں
پیدا ہونے والے بچے کا نام
حبس رکھا گیا
جو تمام عمر نفرت کا شکار رہا

ہوا سے سب سے زیادہ
محبت پتنگ باز کرتا ہے
مگر
پتنگ باز کی چرخی
حبس میں پیدا ہونے والے
بچے کے ہاتھ میں ہے'' (نظم حبس میں پیدا ہونے والا بچہ)
اور لکھا
''آسمان پرندوں سے خالی کرا لیا گیا
آسمان پرندوں سے خالی ہو گیا
مگر
فاشی سے بھر گیا
سڈول ٹانگوں کے درمیاں
سفید سیال بہتا رہتا ہے
پستان تیرتے رہتے ہیں (نظم زیرِ ناف برف کی ڈلیاں)
اور ''لڑکیاں برقعوں کو سیج پہ لٹا کر
دیوار پہ چاک سے
روشن دان بنانے میں جُتی ہوئی ہیں'' (نظم حاملہ برقعے)
پھر لکھا ''اور ہمارے حصے میں
وہ ہم بستریاں آئیں
جو نمازوں کے قضا ہونے کے خوف میں مبتلا رہیں

.....

پہرے داروں نے
ازار بند نیفوں میں ڈالنے کی بجائے
ہمارے گلوں میں ڈال دیے'' (نظم جعلی نکاح ناموں پہ خُدا کے دستخط)

''مبادا لاشوں کے سر
ان کے ہاتھ لگ جائیں
جو لاشوں کے سروں سے فٹ بال کھیلتے ہیں'' [نظم فٹ بال]
''دندناتے پیشواؤں کی مقدس سرزمین پر
ہنی مون منانے کے لیے
گدھ
جوق در جوق آ رہے ہیں'' (نظم ہنی مون مناتے گدھ)

اور پھر اُس نے دانشوروں کو للکارا
''اور.....اور بچے
تتلیوں کا پیچھا کرتے کرتے
جیپوں اور بھاری بوٹوں تلے
کچلے جا رہے ہیں
.....
اُنہیں مت دیکھو
کہ ظلم ہوتے دیکھنا
صرف خُدا اور فوٹو گرافر کو ہی زیب دیتا ہے'' (نظم خُدا اور فوٹو گرافر)

جبر کے نتیجے میں رگ و پے میں سرایت کر جانے والی منافقت کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی اور اسے بے نقاب کرنے کی جرأت، یہ ہے مسعود قمر کی شاعری کا دوسرا بنیادی وصف۔

.....

مسعود قمر کی شاعری کا تیسرا دھارا ترکِ وطن کے بعد سویڈن میں بس جانے کے تجربات پر مشتمل ہے۔

دیکھیں یہ شاعری'' قربتوں کی ریزگاری کا شور
فون کی گھنٹی کی خامشی کا شور

ساتھ بیٹھی محبت کے فاصلے کا شور'' (نظم اکلاپے سے محروم شخص کا اوپیرا)

آپ دیکھیں گے'' تختے میں ملے اسکارف حاضر ہیں، جعلی نظموں سے بھری ریل کار موجود ہے، زندگی کافی کے کپ میں پڑی ہے، کونیاک وہسکی اور سگار ہے، خالی کمرے میں پڑا سیب ہے۔ غرض سبھی اشیائے ضرورت موجود ہیں مگر ان سب کو مقامی افراد کی برف نے لپیٹ رکھا ہے۔ مسعود کی شاعری میں دیکھائی دینے والی گنتی کے دو''Son of soil'' کا احوال بھی سن لیں۔

'' کھڑکی کے پاس بیٹھے

گلہری کو درخت پر چڑھتے

اور جانسن کو پوتے کے ساتھ کھیلتا دیکھو'' (نظم سائیکل چلاتی آتی موت)

تارکین وطن کے ساتھ ایک مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنی جنم بھومی میں دور دور تک پھیلی جڑوں کو پوری طرح نکال اور نئی زمینوں میں پیوست نہیں کر پاتے (نوٹ انہیں اپنے اندر سے اپنی جنم بھومی کی جڑیں نکالنی بھی نہیں چاہیں مسعود قمر) اور بقول ایڈورڈ سعید'' خود ایسے معاشرے میں رہنے پر مجبور ہیں جو ان کا ہے بھی اور نہیں بھی''۔

بھلے ان معاشروں نے اپنے دیس میں دریاؤں کی اُلٹی سمت تیرنے والوں کی تھکن کو آسودگی بھری پناہ دی ہو، نئی سرزمینوں میں پیوستگی کا عمل دہائیوں تک طویل ہو جاتا ہے بلکہ زندگی بھر تکمیل کو نہیں پہنچ پاتا، اسی کارن'' عہد نامہ عتیق'' کے دنوں سے جلا وطنی میں لکھے گئے ادب کو خصوصی زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ دوسرے ادب کے ادیب، مفکر کے خیالات سے متاثر ہو کر رقم کی گئی نظموں کو میں اسی قبیل میں شامل کرتا ہوں۔

'' جاگتے خواب میں زندگی کو دیکھا تھا''

خواب رستہ روکے کھڑا ہے

ذائقے سے خالی زبان، موت ہمیں ہنسانے میں مصروف کر کے ہم سے زندگی چھین لیتی ہے۔ سلاخوں کے درمیان لیا گیا بوسہ جیسی سطریں ہمیں ناظم حکمت، سارتر، کامیو، گارسیا مارکیز اور کئی دوسرے مغربی لکھاریوں کی یاد دلاتی ہیں۔

ایسی نظمیں مسعود قمر کی بہترین نظمیں نہ بھی ہوں مگر ان کی بعض سطروں کو یقیناً شاعر کے اعلیٰ ترین مصرعوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اسی قبیل کی ایک اچھی نظم کا اقتباس بھی سن لیں

''میری ہڈیوں کے گودے میں
اس سال کی بھی برف جم گئی ہے

.....

اوراب
برف، گھاس، چاند اور میں
خواب کے ساتھ
ہولے ہولے جھول رہے ہیں'' (نظم خواب سے بندھا شخص)

.....

موت کے موضوع کو بنیاد بناتی متعدد نظموں کے علاوہ اس کتاب میں درجن بھر نظمیں شامل ہیں جن کے عنوان میں لفظ ''موت'' برتا گیا ہے۔ ''داغدار موت، گھٹیا اور حقیر موت، موت سے اُکتاہٹ وغیرہ وغیرہ۔ کوئی دوسرا شخص موت سے شاعر کی نفرت نما محبت یا محبت نما نفرت کو پورے طور پہ سمجھ نہیں سکتا مگر میری دانست میں ذیل میں درج یہ نظم اس موضوع پہ حرفِ آخر ہے:

''میں نے پہلا ذائقہ
قبر کی مٹی کا چکھا

.....

میں نے گنتی
قبروں کو گنتے گنتے سیکھی
میں نے پہلا حرف
قبر کے کتبے پہ پڑھا'' [نظم سیب کے انتظار میں لیٹی لڑکی]

.....

شاعر نے تاسف کا اظہار کیا
''لوگ ساری زندگی
خوابوں سے خالی
نیند کر لیتے ہیں'' (نظم خالی پن)

''وہ کسی بچے کو قمیض پہ گری قلفی
کھاتا نہیں دیکھ سکتے

.....

اوران کے جوان بچے

ان کوان کے بچپن کے بغیر دفنا کران کی پہلی سالگرہ مناتے ہیں'' (نظم بچپن سے خالی مردہ)

نظم ''بارش بھرا تھیلا'' کے علاہ کئی اور نظموں میں شاعر نے اپنے اندر کے بچے کو مرنے نہیں دیا۔ وہ لکھتا ہے:

''آؤ ہم
مور پنکھ کی شاخوں
کے پر لگا کر
جنگل میں رقص کرتے کرتے
مور بن جائیں'' (نظم گملے سے فرار)

مذکورہ بالا نظم نے میرے ذہن میں مرتضی برلاس کے ایک شعر کو پھر سے زندہ کر دیا

لوریاں دی ہیں کسی قرب کی خواہش نے مجھے
کچھ جوانی کے بھی دن گزرے ہیں بچپن کی طرح

بات ختم کرنے سے پہلے آپ مجھے اپنے اولین دعویٰ میں ترمیم کی اجازت دیں، مجھے کہنے دیجیے کہ مسعود قمر کی شاعری چار نہیں صرف ایک بنیادی ستون پر استوار ہے، اور وہ ستون ہے بے جا معاشرتی پابندیوں سے ماورا، ادھ موئی نہیں مکمل اور فطری زندگی، ایسی زندگی جس میں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک سبھی مراحل شامل ہوں۔ دیارِ غیر ہی نہیں اپنی جنم بھومی میں بھی اور صرف میرے لیے ہی نہیں سب کے لیے۔

پروفیسر عبدالقیوم
لاس اینجلس

گوند کے درخت کا طبعی موت مرنے کا خواب

بہت عرصے سے میں
اپنی نیند نہیں سو سکا
ایک دفعہ میں نے
جاگتے خواب میں زندگی کو دیکھا تھا
میں ایک دفعہ بھی
اپنی موت نہیں مر سکا
وہ عورت
ابھی آ کر مجھ سے لپٹ جائے گی
میں بھی اپنی نظم
اُس کے گلے میں ڈال کر

اُسے نوچنا شروع کر دوں گا

لان میں لگے سارے پودے

گوند کے درختوں میں تبدیل ہو گئے ہیں

بے نیند خواب کے جرمانے

کہاں تک ادا کروں

میں ہر رات

اُس عورت کے ساتھ نیند کرتا ہوں

میں

ایک دفعہ طبعی موت بھی مرنا چاہتا ہوں

گلاب جامن سے بھرے سموسے

عورتو!

تم ہر وقت بیویاں کیوں بنی رہتی ہو

ہماری

محبوبائیں کیوں نہیں بن جاتیں

کیا ہی اچھا ہو

ہم آئس کریم کھاتے کھاتے

لمبی واک پہ نکلیں

عمر بھر ساتھ نبھانے کے عہد و پیماں کریں

تتلیاں پکڑنے کے لیے دوڑتے دوڑتے

ہم تمہاری چیزوں میں

اُلجھ کر گر جائیں

تم بھی بچے جننے کے چکروں سے نکل کر
لکھے گئے خطوط کو پھاڑنے کی ضد کرتی رہو
تم
ہماری محبوبائیں کیوں نہیں بن جاتیں
جو
ہمارے ساتھ کافی پیتے پیتے
نمکین بسکٹ لینے جاتی ہیں
اور
دوسرے کافی ہاؤس میں کسی اور کے ساتھ
گلاب جامن کے ساتھ سموسے کھانے لگ جاتی ہیں
مگر تم تو ہر وقت
بیویاں بن کر قبر تک ساتھ رہتی ہو
عورتو!
تم ہماری بیویاں کیوں بنی رہتی ہو؟

اس کے نام پہلی نظم

یہ کیا ہم ہر وقت
ایک دوسرے کے اندر
گھسے بیٹھے رہتے ہیں
کبھی تو
تو میرے اندر سے نکل
میرے سامنے آ کے بیٹھ
میں بھوبل میں دبے
اپنے پیار کے بھٹے کا ایک ایک دانہ
کیر کیر کر تجھے اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں
تو بھی
مجھے اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے نکال

آ..... ہم لکیروں سے خالی

اک دوجے کا ہاتھ پکڑ کر

اس رات پہ پھیل جائیں

اتنا پھیلیں

صبح کی سفیدی ہمیں دیکھ نہ سکے

تو مجھے

اپنے اندر سے نکال

میں اس اوس بھری رات میں

تیرے پیار کی اجرک

اپنے کندھوں پہ رکھے

تیرے ساتھ بیٹھے

ساری رات تیری نظم سنوں

میرے ہاتھ سے پانچواں جام پکڑ کر جب تو کہے

''اب بس بھی کرو''

تو میں تجھے کہوں

''اور نظم سناؤ''

مگر

ہم تو ہر وقت

ایک دوجے کے اندر
گھسے بیٹھے رہتے ہیں
ہم کب ایک دوجے کو
اپنے اپنے اندر سے نکالیں گے
ہم
کب ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے؟

لہروں کو گنتا مجرم

کئی سال پہلے
وہ جب مجھے
پکڑنے کے لیے آئے
میں سمندر کنارے
اُس لڑکی کے ساتھ لہروں کو گن رہا تھا
جو مجھے سمندری زیور پہنے
سیپیاں چُنتے سمندر کنارے ملی تھی
حکومتی کارندوں کے اجلاس میں
کسی نے بے دھیانی میں میرا نام لے دیا
تو سب کے سب
مجھے پکڑنے کے لیے دوڑ پڑے

مگر

میرے گھر آ کر اُن کو پتا چلا

مجھے پکڑ کے تو وہ

کئی سالوں پہلے ہی کال کوٹھڑی میں بند کر چکے ہیں

آج انہوں نے مجھ سے

میری آخری خواہش پوچھی

تو میں نے کہا

'' میں سمندر دیکھنا چاہتا ہوں''

مگر اب سمندر کنارے

مجھے لہروں کے گننے میں دشواری ہو رہی ہے

لڑکی نے سمندر کے اندر جا کے

لہروں کو گڈمڈ کر دیا ہے

میں نے

سمندر کو لڑکی سمیت

اپنے کندھوں پہ اُٹھایا

اور

حکومتی کارندوں کے پہرے میں

پھانسی گھاٹ کی طرف چل پڑا

شہر کی لڑکیاں کس کونے میں ہیں

شہر کے درخت کہاں گئے؟
وزیر جنگلات نے کٹوا دیئے
شہر کے باغات کہاں گئے؟
وزیر تعمیرات نے
اُن میں پلازے اُگا دیئے
شہر کے سکول کہاں گئے؟
وزیر جیل نے ان میں
بیرکیں بنوا دیں
شہر کے طالب علم کہاں گئے؟
جیلوں میں بیٹھے انقلابی گیت

نیفوں میں چھپانے کی مشق کر رہے ہیں
شہر کے مجرم کہاں گئے؟
اقتدار کے ایوانوں کی رونق بنے
شہر کے تھیٹر اور سینما گھر کہاں گئے
آڑھت کی منڈیوں میں تبدیل ہو گئے
شہر کی لڑکیاں کس کونے میں ہیں
دادیاں نانیاں بنیں
محبت کی شادیاں رکوا رہی ہیں

ساحل پہ پڑا گیلا لباس

وہ
جو موت لکھوا کر آتے ہیں
ساری زندگی
موت کو چھونے کی جدوجہد میں
لگے رہتے ہیں
ہم
موت سے پوچھے بغیر پیدا ہوئے
ہم مال گاڑی کے بنڈل میں
درج ہو چکے تھے
مگر
ہم نے زندگی کو تیز رو میں چڑھتے دیکھ لیا تھا
سمندر پہ نہاتے
ساحل پہ پڑے کپڑوں کو
گیلا سمجھنے والا
کبھی مچھلی نہیں پکڑ سکتا

درخت بنا آدمی

درخت

جو اپنا نام، دل اور تیر
کبھی بھی نہیں کھودسکا
مگر کُھدا ہے
سارے کا سارا میرے اندر

چھاتیوں سے محروم مائیں

جہاز چیختے ہیں

اور

دنیا کانوں پر ایم پی تھری لگائے محوِ رقص ہے

کوڑا کرکٹ پر گدھ بچوں کو نوچ رہے ہیں

مگر

کمپنیاں صاف ستھرے گوشت کو

پیکٹوں میں محفوظ کرنے کے نئے نئے

طریقے سوچ رہی ہیں

چھاتیوں سے محروم مائیں

بچوں کے ہونٹوں پہ

مٹی ملا خون لیپ کر رہی ہیں

مگر

آرٹ گیلریوں میں
رنگوں کے نئے نئے معانی پہ سیمینار ہو رہے ہیں

ہمارے مغنی کے سُروں کی تالیں
بارودی سُرنگوں سے ٹکرا رہی ہیں
اور
کمپنیاں ہر روز تشدد کا
نیا سی ڈی بازار میں لا رہی ہیں
ابھی ہم
سڑکوں، بسوں، دیواروں کیساتھ چمٹے
اپنے چیتھڑوں کو اکٹھا کر ہی رہے ہوتے ہیں
وہ
اپنے لے پالکوں کے جسموں پر
مناجات کی آگ باندھ کر
پھر ہم میں چھوڑ دیتے ہیں

تنہائی کا قحط

میں
بھوکا رہنے کے لیے
قرض پہ قرض لیے جا رہا ہوں
ہر روز بازار جاتا ہوں
ہر روز ناکام لوٹتا ہوں
اچھی کوالٹی کی تنہائی کسی دوکان میں میسر نہیں
دماغ میں بے ہنگم ٹریفک ہے
میں نے حادثے سے بچاؤ کے
سارے سگنل توڑ دیئے ہیں

مگر
کوئی حادثہ رونما نہیں ہوتا
میں
اتنا ڈرپوک ہوں
تیس سال سے ایک ہی عورت سے محبت کیے جا رہا ہوں
میں یہ سب کچھ نہ کرتا
اگر..... مجھ تنہا شخص کے پاس
کوئی اچھی کوالٹی کی تنہائی ہوتی

لفظ ہمیش کی وبا

ایک آدمی
کتنی دیر تک محبت کر سکتا ہے
محبت سمیت کتنی دیر تک زندہ رہ سکتا ہے
ایک محبت.....!
ساری زندگی.....!
ہمیش؟
کبھی تو ایک دن، ایک ہفتہ، ایک ماہ
نفرت بھرے لفظوں کے لیے
سچائی سے بھرپور لفظوں کے لیے
اس سے پہلے
لفظِ ہمیش کی وبا میں

نیست و نابود ہو جائیں ہم
اے ربِّ فراق
اک لمحہ.....نا آشنائی کا
اک لمحہ.....تنہائی کا
اک لمحہ..... ہمیش سے جدائی کا

داغدار موت

اُس عورت نے
ساری کائنات اپنے اندر سمالی ہے
میں نے کائنات کا حصہ بننے سے
انکار کر دیا ہے
اب میں
کوئی نیکی، کوئی بدی
کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا
جو
موت کے بعد مجھے زندہ رکھے
میں
صرف اور صرف موت چاہتا ہوں
صاف و شفاف موت
خودکشی موت کو داغدار کر دیتی ہے

بادشاہ کے شہر میں خریداری

ہمیں
خریدنے ہیں بہت سے کان
جو بہرے ہوں
اور بہت سی آنکھیں
جو اندھی ہوں
ہمیں
خریدنے ہیں بہت سے دل
جو بے حس ہوں
اور بہت سے ناک
جو سونگھنے سے عاری ہوں
ہم
اس شہر میں زندہ رہنا چاہتے ہیں

جوتوں سے نا آشنا سڑکیں

ہمیں جوتوں سمیت
سڑکوں پہ چلنے کی اجازت نہیں
مگر
میں منتظر رہتا ہوں
تمہارے کاغذ پہ اُترنے کا
ہمیں
صرف آدھا جسم
ڈھانپنے کی اجازت ہے
مگر
میں دیکھتا رہتا ہوں تمہیں
کاغذ پہ
لیچی کھاتے ہوئے

ہمیں
کبھی بھی تابوت میں لٹا کر
دفنایا نہیں گیا
مگر

میں دیکھتا رہتا ہوں
کاغذ پہ بکھرے کچنار کے پھولوں پہ
تمہیں نیند لیتے ہوئے
میں سارے کا سارا
کاغذ بن گیا ہوں
تم
کب اُتروگی

ہر وقت کام میں جُتی لڑکی

قہقہے لگاتی تمہاری خامشی
میرے کانوں میں
نیزے گاڑتی رہتی ہے
کان کے پردے پھاڑتی رہتی ہے
''آپ بات کریں''
اس جملے سے تم کب آگے بڑھو گی
کتاب کا کوئی ایک صفحہ تو
اونچی آواز میں پڑھو
کسی سے اونچی آواز میں
پانی کے ایک گلاس کا ہی کہو
کسی سے اونچی آواز میں
سپرٹ چائے کا ہی کہو

جل تھل کرتی بارش میں
تم
چھت پہ کیوں سوکھی کھڑی ہو
بغیر آئینہ دیکھے
بننے سنورنے پہ
تم کو کس نے مجبور کیا
تم
جُت جاتی ہو ہر کام میں
سوائے محبت کے
میں نے جب یہ نامکمل نظم
اُسے سنائی تو اس نے کہا
''پلیز میری زندگی کا سوال ہے
آپ اس نظم کو پھاڑ دیں
کہیں
میں بولنے ہی نہ لگ جاؤں''

ان بکس میں بھیجا گیا سفید گلاب

تم
بیٹھی رہتی ہو بالکونی میں
گملے میں اُگے
اُس سفید گلاب کے پاس
جسے سونگھتا رہتا ہوں میں
ان بکس کی اُس تصویر میں
جو تم صبح ہونے سے پہلے
ہر روز مجھے سینڈ کرتی ہو
اور
کھاتا رہتا ہوں ان بکس میں
وہ جلا ہوا پراٹھا
جو تم مجھے
میسج لکھتے لکھتے جلا دیتی ہو

میں ہر صبح تم کو
جو نظم اور چائے کا کپ
ان بکس میں سینڈ کرتا ہوں
تم ہمیشہ شکایت کرتی رہتی ہو
شکر، دودھ اور نظم کے کم ہونے کا

اور

میں پڑھتا رہتا ہوں
ان بکس میں وہ نظمیں
جو تم اس نوٹ کے ساتھ سینڈ کرتی ہو
''پلیز ان کو فیس بک پہ نہ لگانا
یہ صرف تمہارے لیے ہیں''
فیس بک پہ لگی آگ سے
وہی نظمیں محفوظ رہیں
جو ہم نے ایک دوسرے کو مسینجر پہ سنائیں
ہم نے نظموں اور خود کو محفوظ کرنے کے لیے
نظموں اور خود کو تابوت میں ڈالا

اور

ان بکس میں دفن کر دیا

گملے سے فرار

اس سے پہلے
یہ پودا درخت بنے
اور تنے سے لپٹی
ہمارے ناموں کی پرچیاں پھاڑ دے
آؤ ہم
مور پنکھ کی شاخوں
کے پر لگا کر
جنگل میں رقص کرتے کرتے
مور بن جائیں

ایک نامکمل نظم

کاش
تم یہیں ہوتی
جیسے پہلے نہ ہوتے ہوئے
تم یہیں ہوتی تھی
تم وہ پھول نہ خریدتی
جو مجھے کبھی نہ دے سکی
میں
ان بکس میں وہ جلا ہوا پراٹھا نہ کھاتا
جو تم مجھے
میسج لکھتے لکھتے جلا دیتی تھی
اور
میں تمہیں ان بکس میں

سپرٹ چائے کے کپ نہ سینڈ کرتا
جو تم کبھی نہ پی سکی

کاش
سارے سمندروں کے پانی کو
سیاہی بنتا دیکھ کر تم یہ نہ کہتی
''سنو یہ سیاہی ہماری محبت کی داستان
لکھنے کے لیے ناکافی ہے''
بیسمنٹ کی صفائی کرتے تم
اُس صوفہ کو نہ دیکھتی
جہاں تم نے پہلی بار
اپنی خامشی میرے کانوں میں انڈیلی تھی
کاش
تم بالکونی میں پودوں کو پانی دیتے
مور پنکھ پودے کے پتوں کو دیکھ کر یہ نہ کہتی
''آپ کیسے ہیں''
کاش
تم کہیں نہ ہوتی
اور
میں یہ نظم مکمل کر پاتا

خامشی کے منتظر کان

میں
دفنا کے آ رہا ہوں
ابھی ابھی
اپنے سارے جسم کے اعضاء
سوائے اپنے کانوں کے
کان بضد ہیں
تمہاری خامشی کے ساتھ
دفن ہونے کو
اپنی خامشی بولو
کہ.....میں خود کو سارے کا سارا
دفن کر سکوں
کچھ دن تو زندہ رہ سکوں

زنگ آلود تالے میں اُگا درخت

میں بغیر پاؤں کے
جنگل میں رقص کرتا رہا
اور آنسو
اس کی بالکونی میں پڑے
مور پنکھ کے پودے کی آبیاری کرتے رہے
لوگ
اپنی نیکیوں میں اضافے کے لیے
میری ہر موت پہ
تعزیت کرتے رہتے ہیں
خامشی کی بارش میں بھیگی لڑکی
الفاظ کی فصل کے لیے
بنجر کر دی گئی ہے

مگر
زنگ آلودہ تالے میں اگر
درخت کی شاخیں اُگ آئیں
تو تالا کبھی مقفل نہیں رہتا
او میری پیاری دوست
گو بجھادی گئی ہے
تیرے ان بکس کی سبز روشنی
مگر
میرے دل کے ان بکس میں
تیری محبت کا الاؤ
اب بھی روشن ہے

خواب کے ساتھ بندھا شخص

میں جب صبح گھاس پہ گیا
رات کے خواب کا نشان
گھاس پہ موجود تھا
میں نے سوئی ہوئی گھاس کو
پوروں سے چھوا
تو
خواب ابھی تک جاگ رہا تھا
میری ہڈیوں کے گودے میں
اس سال کی برف بھی جم چکی ہے
مگر
میں نے خواب کو ٹھٹھرنے سے بچالیا

چاند جب
بندھی ہوئی کشتیوں پہ
ہولے ہولے جھول رہا تھا
وہ عورت
چپکے سے خواب سے نکل گئی

اور اب
برف، گھاس، چاند اور میں
خواب کے ساتھ
ہولے ہولے جھول رہے ہیں

چٹخورے باز

کیا
موت سے پہلے
پیدائش کا ہونا ضروری ہے
پیدائش
صرف موت کا ذائقہ چکھنے کے لیے ایجاد ہوئی
ہم چٹخورے باز ہو گئے
اور پیدا ہونا بھول گئے
ہمیں موت کا اتنا چٹخارہ لگ گیا
کہ
ہم پیدا ہوئے بغیر ہی مرنے لگے

ہمیں خود کو حاملہ کرنے کے کتنے مواقع ملے
مگر
چٹخوری عادت کے سبب
اب ہماری پیدائش
گندی نالیوں میں بہہ رہی ہے

مصروفیت کی بنا پہ نہ کی جانے والی محبت

میرے پاس ایک عورت ہے
جو مجھے دوسری عورتوں سے ملاتی رہتی ہے
میں جس عورت سے بھی ملتا ہوں
اسی عورت کی وساطت سے ملتا ہوں
وہ اپنی بہت سی مصروفیت کی بنا پہ
مجھے خود نہیں مل پاتی
مگر
مجھے دوسری عورتوں سے ملواتی رہتی ہے
میں جب کسی عورت سے مل کر تھکا ماندہ
تنہائی کے شور والے کمرے میں آتا ہوں
تیز تمباکو سُلگاتے
تیز برانڈی کے گھونٹ بھرتے
فریم میں بیٹھی

اُس عورت کو دیکھتا ہوں
تو
وہ خود کو یک دم فریم سمیت
میز پہ اُلٹا گرا دیتی ہے
اور
کسی اور عورت کا ہاتھ
میرے ہاتھ میں تھما دیتی ہے
میرے کان میں عورت سے
محبت کرنے کے ہدایت نامہ کی
کھسر پھسر کرتی رہتی ہے
نئی آنے والی عورت بھی
چیونگم کی جگالی کرنے
کشیدہ کاری کے نمونے نقل کرنے
میسج کے ریپلائی کرنے میں مصروفیت کی بنا پہ
پھر مجھے تنہا کر جاتی ہے
مجھے عورتوں میں کوئی دلچسپی نہیں
عورتوں کو بھی مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں
مگر
میں اس عورت کا کہنا نہیں ٹال سکتا
اور
عورتوں سے ملتا رہتا ہوں

محبت کی ریز گاری

ہمارے حصہ میں
زمین پہ پھینکی محبتوں کی وہ ریز گاری آئی
جسے لے کر جب ہم
پھولوں اور تابوت والی دوکان پہ گئے
تو ہم نے خود کو
پھولوں کے بغیر تابوت میں پہلے سے ہی لیٹے پایا
احتجاجی بینر، بے روزگاری کا کارڈ
ان دیکھی فلم، اوپیرا تھیٹر کے ٹکٹ
ادھ پیے سگرٹوں کے ٹوٹے، ڈچ آرٹسٹوں کی پینٹنگ
گلاسوں میں بچی سُرخ وائین
تحفے میں ملے سکارف پہنے
تابوت میں خود کو لیٹے ہوئے پایا
اور پھر ہمارے ہاتھ
محبتوں کی ریز گاری سے بھی خالی ہو گئے

وقت بہت کم ہے

وقت بہت کم ہے
ہمیں
سرگوشیوں کی عادت ڈال لینی چاہیے
دیواروں پہ مخصوص آوازوں سے
پیغام رسانی کے تجربے پہ مکمل عبور حاصل ہونا چاہیے
گونگوں بہروں کی اشاروں کی زبان
سب سے زیادہ کام آ سکتی ہے
ہم بستریوں کا ذخیرہ
کپڑوں کو گندا ہونے سے بچا سکتا ہے
راتوں کی نیند کا کچھ حصہ
نیفوں میں ڈالتے رہیں
(مگر قیدیوں کو شاید پاجامے پہننے کی اجازت نہ ہو)

اندھیرے میں
بغیر آواز پیدا کیے، بغیر گرے
بیت الخلا تک جانے کی پوری پوری مہارت ہونی چاہیے
نیکوٹین کو ناخنوں میں چھپایا جا سکتا ہے
ایک ہاتھ میں قومی سلامتی کا ڈنڈا
مقدس اداروں کے لیے گایا گیا ترانہ
اور
دوسرے ہاتھ میں غداری کی سفید رسّی پکڑے
وہ
کسی وقت بھی یلغار کر سکتے ہیں
اور
ہمارے پاس وقت بہت کم ہے

نجات دہندہ قینچی

ہم کپاس کی اوٹ میں بیٹھے رہے
پھر میں نے سوئی بنائی
اُس نے دھاگہ کاتا
ہم نے ایک لحاف بنایا
اُسی لحاف کا گدّا اور تکیہ بنایا
اُسی لحاف کو اک پہیے والا سائیکل بنایا
اُسی کو چولہے پہ رکھ کے
اک روٹی بنائی
اُسی لحاف کو فٹ بال بنا کے کھیلا
ہم کھیلتے کھیلتے تھک گئے
دو پسینے ایک ہوئے
اور..... اور پھر

پسینے تھکاوٹ سے شرابور ہو گئے
لحاف نے سیٹی بجائی
سائیکل کا ٹائر پنکچر ہوا
لحاف جگہ جگہ سے پریشان ہوا
تو
ہمیں قینچی نے بچایا
ایک لحاف کو دو لحاف بنایا
ہمیں اپنی اپنی نیند سُلایا

گھٹیا اور حقیر موت

میرا اندر
خالی چیزوں سے بھرا پڑا ہے
زندہ رہنے کے لیے
سانسوں کا محتاج ہو گیا ہوں
ذائقہ سے خالی زبان
گوشت کا لوتھڑا بن گئی ہے
میں اور سورج
اُس عورت کا انتظار کر رہے ہیں
برف نے ہمیں چاروں اور گھیر رکھا ہے
ایسے میں اگر موت آ گئی
تو وہ کتنی گھٹیا اور حقیر موت ہو گی

انسان خود کو کتنا خالی کرے

کہ

خود کو بھرا ہوا محسوس کر پائے

کیا میں اپنا اندر

خالی چیزوں سے خالی کر پاؤں گا

کیا وہ عورت

میرا خالی کشکول

اپنی محبت سے بھر دے گی

کیا میں

خود کو کبھی بھرا ہوا محسوس کر پاؤں گا

ہم بہت ہیں

(مسنگ پرسنز کی بازیابی کے لیے کوئٹہ سے کراچی اسلام آباد پیدل احتجاج کرنے والوں کے نام)

راستے کے سارے درخت
ہمارے ساتھ ہیں
رات جب ہم پڑاؤ کرتے ہیں
سورج
ہمارا اگلا دن روشن کرنے کے لیے
ہم سے جُدا ہوتا ہے
ہر گم شُدہ
ہمارا سنگِ میل ہے
ٹھٹھرتی راتوں میں چلغوزوں کے چھلکے
جب تمہارے لحافوں میں گم ہوتے ہیں
تو تمہاری نیند

خوابوں سے خالی ہو جاتی ہے
مگر
ہمارے تلووں کے چھالے
ہمارے پاؤں کے خواب بن جاتے ہیں
دسمبر کی سرد راتیں
جب ہمارے جسموں کو منجمد کرنے لگتی ہیں
تو ہم حراستی مراکز میں
جلتے جسم پہن لیتے ہیں
تم
اگر قیمے سے بھرے بینگن بنانے کی ترکیب
دیکھتے دیکھتے تھک جاؤ
تو سیڑھی لگا کر
کسی بھی دوسرے چینل کے آنگن میں اُتر جانا
جوان نظر آتی بوڑھی
گُم شدہ قسمتوں کے کارڈ کھولے
تمہاری منتظر ہوگی
ہماری فکر نہ کرنا

ہم ..... اکتیس دسمبر کی رات
(جو کہیں بھی آ جائے گی)
اپنے پیاروں کی مسخ شدہ

لاشوں کے ساتھ
محوِ رقص ہوں گے
ہمیں خبر ہے
ہم اکیلے رہ جائیں گے
کیونکہ..... ہم بہت ہیں

نظم کی پیدائش

رات
بہت عرصے بعد
میں اور شاعری ایک ساتھ سوئے
رات نے
ترازو کے ایک پلڑے میں پڑی
بحروں کی گنتی
اور
دوسرے پلڑے میں پڑے باٹ کو
روایت کے میوزیم میں رکھ دیا
صبح شاعری نے اپنی چھاتیوں کو
بھاری بھاری محسوس کیا
ہم نے دیکھا
نئی نظم ہمارے ساتھ لیٹی ہے

پیدائش کے لیے بوڑھا ہوتا آدمی

میں بوڑھا ہو رہا ہوں
جس سے نفرت نہ کر سکو
اُس سے محبت کرنا بیکار ہے
میں
اُس عورت کو ہاتھ تک نہیں لگاتا
مگر
کافی ہاؤس میں بیٹھا بیٹھا
اُس کے بچوں کا باپ بنتا رہتا ہوں
میں
اُس عورت کی محبت میں مر رہا ہوں
وہ عورت محبت کو مار رہی ہے

میں اُس کو ہاتھ لگاؤں گا
تو مر جاؤں گا
میں اُس کو ہاتھ لگائے بغیر مر رہا ہوں
مجھے اُس کی محبت کے لیے
پھر سے پیدا ہونا پڑے گا
میں
اپنی پیدائش کے لیے بوڑھا ہو رہا ہوں

اکلاپے سے محروم شخص کا اوپیرا

بک شیلف میں پڑی
خاموش کتابوں کا شور
جیب میں پڑی
قربتوں کی ریزگاری کا شور
کمروں میں پھرتی
بیوی کی خامشی کا شور
فون کی خامشی کا شور
ساتھ بیٹھی محبت کے
فاصلے کا شور
فیس بک کی دی ہوئی
زندگی کا شور
شور کی بارش اتنی تیز تھی
اکلاپا میرے دیکھتے دیکھتے بہہ گیا

میں دونوں جوتوں میں اپنے پاؤں ڈالنا چاہتی ہوں

(ایک مسنگ پرسن کی بیٹی سے گفتگو کے بعد)

بابا کی عینک کی ایک آنکھ
گھر کی دہلیز کے باہر پڑی ہے
دوسری ٹارچر سیل کی دہلیز کے اندر
میں
بابا کی دونوں آنکھوں کو
ایک ساتھ چومنا چاہتی ہوں
بابا کی نظم کی چند سطریں
گلی میں
جیپ کے ٹائروں کے نشانات پہ پڑی ہیں
میں

بابا کی نظم مکمل کرنا چاہتی ہوں
بابا کے جوتوں کا ایک پاؤں
چارپائی کے نیچے اُلٹا پڑا ہے
دوسرا ٹارچر سیل میں
بھاری بوٹوں تلے مسلا پڑا ہے
میں
بابا کے دونوں جوتوں میں
ایک ساتھ پاؤں ڈالنا چاہتی ہوں
میں
بابا کی فریم میں ہنستی تصویر کو
چومتے چومتے جوان ہوئی
میں
بابا کی آنکھیں، ماتھا، رخسار
ہاتھ اور ہونٹوں کو
چومنا چاہتی ہوں
چاہے وہ مسخ شدہ ہی کیوں نہ ہوں

سنگِ بنیاد کا کتبہ

جب
اُس نے انکار کیا
تو
اس سے پہلے میں
محبت کے کبھی اتنا قریب نہیں تھا
محبت میں رہنے کے لیے
دوسرے کو
انکار پہ اُکسانے کا فن آنا چاہیے
سنگِ بنیاد
کتبہ بننے میں
زیادہ دیر نہیں لگتی
جنگل میں پگڈنڈیاں بنانا
شہر کی بنیاد رکھنے کی شروعات ہیں

اُدھار خریدی ہوئی موت

ابدیت کے دوسری طرف
کچھ بھی نہیں
زندگی
زندگی سے پہلے بھی
زندگی تھی
زندگی کے بعد بھی زندگی ہے
تو
چلو آج کوئی سستی سی زندگی خرید لیتے ہیں
گھر لا کر اُسے
بنا سنوار لیں گے
مگر.....
اُس عورت سے پہلے
اُدھار موت خریدی تھی
اُس کے پیسے ابھی تک نہیں دیے

ایوا کے چمکتے سیب

دن میں
رات کی پیوند کاری کرنا
رات کو ابدی بنانا ہے
میں
سمندر میں پردہ تان کر
کُجوں سے نہیں نہاتا
بھکاری سے بقایا مانگنا
خود کو بھکاری بنانا ہے
کٹی پتنگ سے ڈور بچانا
دھاگے سے
محبت کی نشانی ہے
ایوا کے سیب
صرف
چمکتی دھوپ میں دیکھنے چاہئیں

تلاشِ ذات

سارے رستے
شہر کی طرف جاتے ہیں
نیکی اور بدی کی طرف
مجھے تو خود تک پہنچنا ہے
میں خود سے کیسے باہر نکلوں
خود تک پہنچوں
باہر تو سارے رستے
نیکی اور بدی کی طرف جاتے ہیں

اکو حرف درکار

تفصیل سے مرنا ایسے ہے

جیسے

آدمی کوئی ناول لکھ رہا ہو

میرے

پاس وقت بہت کم ہے

میں کوئی مختصر افسانہ نہیں لکھ سکتا

میں نے

ایک افسانے کا خاکہ سوچ رکھا ہے

مگر

مجھے اُس کا پہلا حرف نہیں مل رہا

جس دن مل گیا

وہ میرے افسانے کا آخری حرف ہوگا

انصاف نامی قبرستان کی ایک مجرم قبر

جب میری آنکھوں پہ پٹی
باندھ کر سیاہ رات کی
تو
سارا بندی خانہ سفید کبوتر کے پَر بن گیا
جب انہوں نے میرا
پہلا ناخن اکھاڑا
تو درد مجھ سے کوسوں دور تھا
جب انہوں نے میری زبان
کاٹ کر لٹکتے چھوڑ دی
تو میرے اندر
لفظ گنگنانے لگے
جب انہوں نے میرے

کانوں میں سیسہ پگھلا کے ڈالا

تو

بندی خانے سے باہر

چڑیوں کی چہچہاہٹ

مجھے صاف سنائی دے رہی تھی

جب انہوں نے میرے

بائیں ہاتھ پہ عمر کی لکیر پہ میخ ٹھونکی

تو

میں نے اپنا نام

عمرِ جاوداں رکھا

مگر

جلاد تحقیقاتی کمیشن کا سربراہ بنا

اور

لوگوں نے انصاف کے ترازو میں

پڑے باٹ کے ہار

جلاد کے گلے میں ڈالے

تو..... میری موت واقع ہوگئی

اور مجھے

انصاف نامی قبرستان میں دفنا دیا گیا

جعلی نظموں سے بھری ریل کار

مجھے
ہر عشق میں صرف
چند نظمیں ہی ملیں
ریل کار میں ٹکٹ کا اجرا
کس نے کیا؟
مچھلیاں
سمندر میں لوگوں پہ ٹھٹھا کر رہی ہیں
مگر لوگ
سمندر کنارے اک دوجے پہ چڑھے
☆ سبت کے گزرنے کا انتظار کر رہے ہیں
لوگ تمہارے ذکر کے بغیر

میری نظمیں یوں پکڑ لیتے ہیں
جیسے
بغیر ٹکٹ کے مسافر کو ٹکٹ چیکر
میں
جعلی نظمیں لکھنے کی سزا
آخری ڈبے میں بیٹھا کاٹ رہا ہوں
تم کب میری نظموں میں آؤ گی
مجھے
آخری سٹاپ پہ پہنچانے کے لیے

نوٹ: سبت یہودیوں کا مقدس دن ہفتہ

قہقہوں سے بھرا تابوت

ہم ایک دن
بس یونہی بے دھیانی میں
کُھل کر قہقہے لگانے میں مصروف ہوتے ہیں
اور
اُداسی کی موٹی چوہیا
ہمارے اندر گھس جاتی ہے
بک شیلف میں پڑی کتابوں
سُرخ شراب کی بوتلوں، فیروزی رنگ کے سکارف
اور
میز پہ پڑی سگریٹ کی ڈبیا سے
ہمارے قہقہے کُترتی رہتی ہے
ہم خوشی سے سرشار
ایوا سے سیب خریدنے جاتے ہیں
مگر

اُداسی کی موٹی چوہیا
ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی
سیبوں والے پلڑے میں بیٹھ جاتی ہے
اور
ایوا کو ایک سیب کم کرنا پڑتا ہے
مگر اُداسی کی موٹی چوہیا کو خبر نہیں
ہم نے قہقہے تکیے کے نیچے
''قہقہہ انسان نے ایجاد کیا'' میں چُھپا کے رکھے ہیں
جس دن طاعون سے
ہماری موت واقع ہوگی
اس کمینی موٹی چوہیا کے دانت
کھٹے کرنے کے لیے
یہ قہقہے ہمارا تابوت بھر دیں گے

فضاؤں میں لکھا پوسٹل ایڈریس

جب وہ
پہلی بار مجھ سے بچھڑی
تو میں رو دیا
دسویں بار مجھ سے بچھڑی
تو میں نے دس نظمیں لکھیں
اور پھاڑ دیں
اب وہ کہیں نہیں ہے
مگر
میں اُسے دیکھے بغیر صبح نہیں کر سکتا
میں نے اُسے وہاں وہاں ڈھونڈا
جہاں جہاں اُسے نہیں ہونا تھا
میں بھی اب کہیں نہیں ہوں

میں نے خود کو وہاں وہاں دیکھا
جہاں جہاں میں نے نہیں ہونا تھا
اُس نے پَر پہ اپنا پتہ لکھا
میں فضاؤں میں اُس کا
پوسٹل ایڈریس ڈھونڈتا رہا
اُس نے پتے والا پَر
کسی کے سوراخوں والے ہیٹ میں لگایا
اور اس کے ساتھ ٹینگو ناچتی رہی
اور میں
ان دونوں کے ساتھ
سیکسوفون بجاتا رہا

احتیاط

مجھے علم تھا
اُس نے مجھے چھوڑ جانا ہے
میں نے احتیاطاً
ایک عشق کا انتظام کر رکھا تھا

سلاخوں کے درمیان لیا گیا بوسہ

ہر لڑکی
شادی کرانے کے بعد
محبت کو چکمہ دینے میں
کامیاب نہیں ہو پاتی
درخت بغیر ٹکٹ خریدے
ریل کار میں سفر کرتے رہتے ہیں
اور سفر کے اختتام پہ
ٹکٹ چیکر کو چکمہ دے کر
پرندوں سمیت
غائب ہو جاتے ہیں
قیدی کو جس لڑکی کے سبب

آج رات کے پچھلے پہر
پھانسی پہ لٹکایا جائے گا
اُس نے پہرے دار کو
چکمہ دے کر
سلاخوں کے درمیان
اُس لڑکی کا بوسہ لے لیا
موت
ہمیں ہنسانے میں مصروف کر کے
ہم سے زندگی چھین لیتی ہے
اور.....اور
پھر ہمارے ساتھ زندہ پھرتی رہتی ہے

برف کبھی بھی آگ بن سکتی ہے

ہمیں لڑکیوں کی
دوسری، تیسری، چوتھی یا پانچویں
محبت پہ اعتراض نہیں کرنا چاہیے
اور انہیں پہلی محبت کا سپارہ
رٹانے سے باز رہنا چاہیے
موسم کو سمجھنے میں نااہلی پہ
برف میں منجمد ہونے کے خوف سے
سفر کو آدھے راستے میں ملتوی کرنا
محبت اور سفر کی توہین ہے
برف کے اُس پار محبت کا جلتا الاؤ
تمہیں کسی وقت بھی
بانہوں میں لے سکتا ہے

میں
اُس سے باتیں کرتا رہتا
مگر
مجھے اُس کی آواز سننے کے لیے
سمندر کنارے جانا پڑا
جہاں وہ سمندر کے درمیان
خاموش لیٹی گنگنا رہی تھی
میں اور سمندر
اُسے سُننے کے لیے
سانس روکے بہتے رہے

احتیاطاً

میں ہر روز
زمین اور دیوار سے چمٹے
اپنے جسم کے چیتھڑے اکٹھے کر کے
سائیکل کی گدی پہ رکھتا ہوں
سائیکل کی بریکیں
اور
ٹائیروں کی ہوا چیک کرتا ہوں
سائیکل کی گھنٹی بجا کر
تسلی کر لیتا ہوں
سائیکل کا سائیڈ مرر کا

زاویہ درست کر لیتا ہوں
پیٹ کو گدی پہ رکھ کر، کام کے پیڈل مارتا ہوں
میں ہر روز یہ سب احتیاطاً کرتا ہوں
مبادا
راستے میں کوئی حادثہ نہ ہو جائے
کہیں میں ہلاک ہی نہ ہو جاؤں

کافی کے کپ کے ساتھ پڑی زندگی

میں زندہ ہوں
مجھے کوئی نہیں مار سکتا
میرے مرنے کے بعد بھی
تم
کبھی بھی کہیں بھی جا سکتی ہو
گلاب جامن کے ساتھ سموسے کھانے
زندگی اگر
گلاب جامن کے ساتھ
سموسے کھانے کا نام ہے
تو جانِ من
زندگی تمہارے اِس
کافی کے کپ کا بھی نام ہے
جو میرے سامنے پڑا ہے
تمہارے بغیر

دیوار سے لٹکا خواجہ سرا

میں جب بھی
زندگی کی رنگینی میں
کھونا چاہتی ہوں
تو میں دیوار سے لٹکے
خواجہ سرا کو اُتارتی ہوں
اُس کا چمکیلا لباس
اور اُس کا کرب اوڑھ لیتی ہوں
اُس کے دودھ سے خالی پستان
ادھ بجھی خواہشوں کی لپ اسٹک
اور
لوگوں کے آلاتِ راحت پہ
بجتی تالی اپنے دونوں ہاتھوں پہ بجاتی ہوں

میں غسل خانوں سے
خود کو کنواری کہنے والیوں کا
کنوار اپن حاملہ نالی میں
بہتا دیکھتی رہتی ہوں
دو جسموں کی آسودگی سے
سنتِ خواجہ سرا سے
لطف اندوز ہوتی رہتی ہوں
اور جب
ضمیر کی بدکاری کی کوٹھڑی کو
جاتا سارا رستہ ناپ لیتی ہوں
سارے مرد تاک لیتی ہوں
تو گھر آ کر بدچلن
واجب القتل خواجہ سرا کو
دیوار پہ دوبارہ لٹکا دیتی ہوں
اور
اپنی تنہائی کی پاکیزگی
اور
اکلاپے کے کنوارے پن سے
ہم بستری کرنے لگ جاتی ہوں

نوٹ! یہ نظم میں نے اپنی دوست نینا کنول کی نظم سے متاثر ہو کر لکھی

بغیر معاوضہ لیے پہلا دیکھا گیا خواب

وہ
اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی اُنگلی میں
زمردی آنکھوں والے
سانپ شکل کی انگوٹھی پہنے رہتی
لوگ
معاوضہ دے کر اپنے لیے
اس سے خواب خریدتے
وہ شام چھ بجے تک
تمام خوابوں کا بیعانہ پکڑ لیتی
اور
ناشتے کی میز پہ

لوگوں کی آنکھوں میں
اُن کے خواب ڈال دیتی
اُس کے گاہکوں میں
محبوبہ کو مور پنکھ کا
پودا دینے والا نوجوان
سوکھی بچہ دانی والی عورتیں
خسارے میں جانے والے تاجر
کرپٹ جنرل، سول افسر، جج
پھانسی کا منتظر قیدی نمبر ۱۲
حوروں کے لیے قطار میں کھڑا ملا
اور
خُدا کی بادشاہت میں
داخلے کے منتظر پادری ہوتے
جب سارا شہر
خواب خریدتا خریدتا
اُس کا کنگال ہو گیا
تو
اُس نے پہلی بار اپنے لیے خواب دیکھا
خواب میں اُس نے خود کو دیکھا
اور پھر وہ.....کبھی نہ سو سکی
پھر.....اُس نے کبھی خواب نہ دیکھا

آخر اُس نے سمندر کو کہا
''میرے لیے خواب دیکھ''
سمندر نے
زمردی آنکھوں والی
سانپ شکل والی انگوٹھی
اور
خوابوں سے خالی آنکھوں کو
اپنی لہروں میں لیا
اور اپنے خواب میں لے گیا

نوٹ: میں نے اس نظم کا خیال گیبرئیل گارسیا مارکیز کی کہانی ''میں اپنے خواب بیچتی ہوں'' سے لیا ہے

ہاؤس آف لوسٹ لیٹرز

میں نے
نظمیں، کچنار کے پھول، راگ ملہار
اور
لیچی کے ذائقے
لفافوں میں بند کر کے
اُسے جو پوسٹ کیے تھے
وہ سارے کے سارے
''ہاؤس آف لوسٹ لیٹرز''
میں پہنچا دیے گئے ہیں
جہاں بیٹھا بوڑھا آدمی
منہ میں بجھا ہوا سگار دبائے
غلط پتوں والے خطوط کو

سال ہا سال کی تگ و دو کے بعد
اصلی پتوں پہ پہنچا دیتا ہے
جن خطوط کے پتے نہیں ملتے
بوڑھا آدمی
منہ میں دبایا ہوا بجھا سگار جلاتے
ایک دن ان خطوط کو بھی جلا دیتا ہے
میری محبت بھی
''ہاؤس آف لوسٹ لیٹرز''
میں پہنچا دی گئی ہے
جہاں بیٹھا بوڑھا آدمی
منہ میں دبایا ہوا بجھا سگار جلاتے
اسے بھی ایک دن جلا دے گا

نوٹ: یہ نظم گیبرئیل گارسیا مارکیز کے ایک افسانے سے متاثر ہو کے لکھی گئی ہے

موت کی تنہائی

موت کے بعد زندہ رہنا
موت کی
اذیت ناک تنہائی ہے
موت
زندگی کی تنہائی سے
نجات دلاتی ہے
مگر
موت کی تنہائی سے
نجات کون دلائے گا
زندگی کی تنہائی
کاہل آدمی کو اتنا مصروف رکھتی ہے

وہ

موت کی تنہائی کی کوئی نظم پڑھ نہیں پاتا

درخت کا تنا

مر کر بھی ٹوٹی سڑک کے کنارے

سال ہا سال

اپنی موت کی تنہائی کے عذاب میں پڑا ہے

دیمک کی اپنی مصروفیت ہے

اور

چولھے نے اپنے لیے

درخت کو ناکارہ قرار دے دیا ہے

میں

اُس کی محبت میں کتنا تنہا تھا

اور اب اُس کی

محبت کی موت کی تنہائی کے

عذاب میں مبتلا ہوں

پیدائش سے پہلے لکھا گیا گیت

موت کی پیدائش
زندگی سے خالی ہوتی ہے
میری پیدائش
موت کو مار کر ہوئی
موت کی دُھن پر
پیدائش کا رقص نہیں کیا جا سکتا
حکومتی دائی کے بغیر
جنم لینے والے بچے کی چیخ
ریشماں دائی کے
پستانوں میں پڑی رقم
پیدائش کے ٹینگو ڈانس کو

اور تیز تر کر دیتی ہے
موت کو دفنائے بغیر
ہونے والی پیدائش
ہمیشہ
موت کو ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے
میں
موت کے بغیر پیدا ہوا

قبر کی موت

میری پیدائش
قبر میں ہوئی تھی
میں چھلانگ لگا کے زندگی سے ملا ہوں
میں
قبر کو ہمیش کے لیے قبر میں دفن کر آیا ہوں
مردے ہر روز
موت کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے آتے ہیں
اور
موت کی زندگی کی دعا مانگتے رہتے ہیں
میں
زندگی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
احتجاجی پوسٹروں پہ لیوی لگاتا رہتا ہوں

جیل کی کال کوٹھری میں لگے
تنگ سلاخوں والے دروازے سے
لڑکی کو اندر آنے میں مدد کرتا ہوں
ہم ساری رات نظمیں لکھتے ہیں
جن لوگوں کے کاغذ نظموں سے
اور دل
لڑکیوں سے خالی ہوتے ہیں
وہ اپنی قبریں لے کر
قبروں میں جا کے دفن ہو جاتے ہیں
میری نظمیں مجھ سے پہلے
پھانسی گھاٹ پہنچ کر
پھندے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں
اور میری گردن
کبھی لمبی نہیں ہوتی

محبت کی سرسوں

ہمیں
چاہئیں بہت سی ملالہ
جو
ڈال سکے بچیوں کے گلے میں
کتابوں کے بستے
ہمیں
چاہئیں بہت سے ہنگو کے اعتزاز
جو
خودکش بمبار سے لپٹ کر محفوظ کر سکے
تختی کے پورنوں پہ لکھنے والے ہاتھ
ہمیں
چاہئیں سنسر کے ایسے قوانین
جو

روک سکیں چھپنے سے منافقت بھرے مذمتی بیان
چاہئیں ایسی لغات
جہاں قاتل کو لکھا ہو قاتل، شہید نہیں
ہمیں
کاٹنے ہیں وہ پاؤں
جو
کھیلتے ہیں انسانوں کے سروں سے فٹ بال
ہمیں
اُتارنی ہیں ججوں کے سروں سے
وہ سفید وگیں
جو
درندوں کی وکالت کے صلے میں
پہنے ہوئے ہیں اپنے سروں پہ
ہمیں
اُگانی ہے اس زمین پہ
محبت کی سرسوں
اور
اُگانے ہیں اس زمین پہ
بہت سے انسانی رنگت کے گلاب

نظموں کا جیب کُترا

مجھے
جتنی محبتیں ملیں
ہجر کے وصال میں ملیں
میں کاغذ پہ اُترا
اپنا ہجر اور اس کا وصال لے کے جب
ناشر کے پاس گیا
تو
چھاپے خانے کی ساری مشینیں
زنگ آلود نکلیں
سیاہ رات اور سڑک کے درمیان
کالی بلی کی آنکھیں
مجھ پہ میاؤں میاؤں کی سیاہ روشنی ڈالتی رہیں
اور میں اُسی طرح گھر واپس آیا

جیسے محنت کش جیب کترا
ناکام گھر واپس لوٹتا ہے
اور اب
ہجر کی کالی بلی
میرے بک شیلف، فیروزی سکارف
میرے بستر، سُرخ وائین اور وہسکی کے گلاسوں میں بیٹھی
مجھ پہ میاؤں میاؤں کرتی رہتی ہے

کاغذ کا ناپ

جب لڑکی
سیب اور انار خرید رہی تھی
ہم مصروف رہے
سائیکل مرمت کرانے میں
آڑھت منڈی میں
دوکان حاصل کرنے میں
ماہ رمضان میں کمائی گئی وکری
دس بار گننے کے بعد ایک بار اور گننے میں
چیکوں پہ دستخط کروانے کے لیے رشوت دینے میں
جوان زندگی میں
موت کا کتبہ لکھوانے میں
اور اب

کمینگی کی حد تک
ڈھونڈتے پھرتے ہیں دوکانوں پہ
ریڈی میڈ محبت
مگر
وقت کے چالاک درزی نے
ہمارے ناپ والے کاغذ پہ
سمو سے کھا کر اُسے کہیں پھینک دیا ہے

نظم سے خالی کاغذ

لڑکی جب مجھ سے
نظم لکھوا رہی تھی
میں نے اُس سے اُس کا پتہ پوچھا
اُس نے کہا
''خواب نگر''
میں نظم مکمل کر کے
جب اُس کے پتہ پہ پہنچا
تو وہ نظم گنگناتے ہوئے
سامان باندھ رہی تھی
نظموں کی پوٹلی لگنے سے

جب میری آنکھ کھلی
تو میز پہ
سیاہی کے بغیر قلم
نظم کے بغیر سفید خالی کاغذ پڑا تھا
میں نے پھر کبھی کسی سے
اُس کا پتہ نہیں پوچھا
میں نے پھر کبھی
کوئی خواب نہیں دیکھا
میں نے پھر کبھی
کوئی نظم مکمل نہیں کی

آتش دان میں ٹھٹھرتی محبت

کبھی آپ نے دیکھا کھڑکی سے
دھوپ رخصت ہو رہی ہوتی ہے
تو محبت بھی
دھوپ کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہے
دھوپ آپ سے زیادہ
محبت سے محبت کرتی ہے
محبت کی قمیض پہ کھلتے پھول
دھوپ کی روشنی سے کھلتے ہیں
محبت کے ہونٹوں پہ گلاب
دھوپ کی روشنی سے اُگتے ہیں
محبت کے بالوں میں چمک

دھوپ کی آنکھ مچولی سے آتی ہے

دھوپ
محبت کو کبھی بھی ٹھٹھرنے نہیں دیتی
محبت کو ٹھٹھرنے سے بچا نہیں پاتی
تو
محبت کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے
اور آپ.....
آتش دان کے سامنے
دستانے پہنے
کونیاک، وہسکی اور سگار پیتے رہ جاتے ہیں

نیند کی خفیہ پگڈنڈیاں

رات کا دو بجا ہے، خواب رستہ روکے کھڑا ہے
میں
نیند کی خفیہ پگڈنڈیاں ڈھونڈ رہا ہوں
میں آج تک خالص نیند نہیں سو سکا
اُس عورت نے
میری نیند میں ملاوٹ کر دی ہے
میں خوابوں سے کیسے نکلوں
نیند تک پہنچ پاؤں
میری نیند کی ساری پگڈنڈیاں
اُس عورت کے خواب کی طرف جاتی ہیں
میں منتظر ہوں خالص خواب کا
جب وہ میرا ہاتھ پکڑے
اور
میں ہمیشہ کے لیے خالص نیند سو جاؤں

دستانوں سمیت آٹا گوندھنا

سیب اُگانا
گندم کھانے سے بہتر عمل ہے
دستانوں سمیت آٹا گوندھنے سے بھوک

اور

کپڑوں سمیت ہم بستری کرنے سے
تھکاوٹ کبھی ختم نہیں ہوتی
گاڑی اچانک جنگل میں رُک جائے

تو

آدمی محبوبہ کو ان پوسٹ کیے گئے خطوط
ترتیب دے سکتا ہے

پلیٹ فارم پہ لکھی گئی نظم
ٹکٹ چیکر کے ہاتھ لگنے کا خوف
منزل پہ پہنچ کے بھی
سفر کے ادھورے پن کا احساس دلاتا رہتا ہے
جنگلوں میں
اُگائے گئے شہروں کا ازالہ
ویجیٹیرین بن کر
نہیں کیا جا سکتا

درمیانی وقت میں محبت کی خواہش

میری پھانسی
ملتوی کر دی گئی
حکومتی کارندے
اُس لڑکی سے پھانسی دینے کا طریقہ پوچھنے گئے ہیں
جس نے مجھے
پھانسی دینے کی خواہش کی تھی
مگر

ادبی اجلاسوں، ایوارڈ کی تقریبات
اور فیشن شو کی صدارتوں میں مصروفیت کی بنا پہ
میری پھانسی پہ عمل درآمد کرانا بھول گئی تھی
اگر

مجھے پتا چل جائے
پھانسی کتنے وقت کے لیے ملتوی کی گئی ہے
تو اس درمیانی وقت میں
میں اُس لڑکی سے
ایک بار اور محبت کرلوں

کنارے پہ سوکھا آدمی

میں
جب بھی سمندر کو دیکھتا ہوں
وہ لڑکی
سمندر اور میرے درمیان
آ کے کھڑی ہو جاتی ہے
اور
میں فیصلہ نہیں کر پاتا
میں دونوں میں سے کس کے اندر نہاؤں

حاملہ برقعے

سارے گھر
کھڑکیوں اور روشن دانوں کے بغیر بن رہے ہیں
دروازے کھلے بھی ہوں
تو
ان کے کنڈوں میں
غیرت اور عقیدوں کے وزنی تالے لٹکے رہتے ہیں
زیتون والی فاختہ کی تصویر
اب صرف پرانے رسالوں میں ملتی ہے
بوڑھوں نے سارے زیتون
فاختہ کے منہ سے چھین کر
راتوں کو اپنی مردانگی جگانے کے لیے کھا لیے ہیں

لڑکیاں برقعوں کو سیج پہ لٹا کر
دیوار پہ چاک سے
روشن دان بنانے میں جُتی ہوئی ہیں
برقعے پیدائش کے
اور لڑکیاں
دیوار پہ روشن دان بننے کی منتظر ہیں

زیرِ ناف برف کی ڈلیاں

آسمان
پرندوں سے خالی کرالیا گیا ہے
پرندے اپنے مسخ شدہ چہروں سمیت
گندے نالوں اور ٹوٹی سڑکوں کے کنارے
اپنا آخری بلاگ لکھ رہے ہیں
آسمان
پرندوں سے خالی ہو گیا ہے
مگر
فحاشی سے بھر چکا ہے
سڈول ٹانگوں کے درمیان
سفید سیال بہتا رہتا ہے
پستان تیرتے رہتے ہیں

اسی لیے
ٹی وی اینکر ان کی گولائی
بتانے سے قاصر ہے
ہجوم
اک دوجے پہ چڑھا
فحش آسمان پھاڑ کر
نیچے گرانے کی تیاری میں
جُتا ہوا ہے
لڑکیاں
زیرِ ناف برف کی ڈلیوں میں
ابدی نیند جاگ رہی ہیں

تو میرے دماغ کے دائیں کونے میں رہتی ہے

تو میرے دماغ کے
دائیں کونے میں رہتی ہے
میں اپنے سارے کام
دماغ کے دائیں کونے میں کرتا ہوں
دماغ کے بائیں کونے میں صرف
گفتگو ہے
جو الفاظ کی محتاج ہے
زبان ہے
جو گوشت کا لوتھڑا ہے
اور ذائقہ کی محتاج ہے

جسم ہے
جو خون کے دوڑنے پھرنے کا محتاج ہے
دماغ کا دایاں کونہ تخلیق ہے
کچنار کے پھول
یحییٰ کے شگوفے، بسم اللہ خان کی شہنائی
میری نظمیں
اور
جہاں تو تخلیق ہوئی ہے
دائیں کونے کے انسان نے
اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے
خُدا کو ایجاد کیا
مگر
خُدا اپنے تخلیق کار کو چھوڑ کر
اپنی پوجا کروانے کے لیے
دماغ کے بائیں کونے میں چلا گیا
بایاں کونہ محتاجی کا کونہ ہے
الفاظ، ذائقہ، خون
اور خُدا کی محتاجی کا کونہ
جسم کو موت ہے
پوجا کو موت ہے
تخلیق کو موت نہیں

کچنار کے پھول، لیچی کے شگوفے
بسم اللہ کی شہنائی
میری نظمیں
اور
تجھے موت نہیں

میلی ٹوپیاں

دیکھو
میری آنکھ کا بایاں کونہ
ابھی تمہارے پتھر سے نا آشنا ہے
اور میں دیکھ رہا ہوں
گو دھندلی دھندلی ہی سہی
مگر اُڑتی ہوئی فاختہ کو
میرے بائیں کان کے بالکل نچلے حصہ پہ
لگا نہیں ابھی کوئی تمہارا پتھر
اور میں سُن رہا ہوں
مارٹن لوتھر کنگ کا نغمہ
''میرا ایک خواب ہے''
اور ہاں

دماغ سارے کا سارا بھی پچک جائے

تو

دماغ کا ایک کونہ زندہ رہتا ہے

سنو

میرے دماغ کا

صرف اور صرف ایک ہی کونہ

میلی کر دے گا، تمہاری گول گول سفید ٹوپیاں

اور بے وزن کر دے گا

تمہارے پتھر اور تمہاری مناجاتیں

نظموں بھرا تکیہ

(بلاگر احمد وقاص گورائیہ کے نام)

منہ پہ تکیہ رکھ کر
تم
کسی کو مار سکتے ہو
مگر
مرنے والا اپنی سانسیں
تکیے پہ چھوڑ جاتا ہے
تکیے کو اگر تم جلا بھی دو
مگر
تکیے کی سانسیں اور نظمیں

قاتل کے کانوں میں
سوراخ کرتی رہتی ہیں
پھولوں کے باغ پہ
چھاؤنی بنانے والے بھول جاتے ہیں
پھول چھاؤنی کی دیوار
پھاڑ کر اُگ آتا ہے

برفیلی سُرنگ کی قیدی

(بلاگر سلمان حیدر کے نام)

سفید وگ پہنے جج نے کہا
''سورج تمہیں کہاں ملا؟''
وکیل نے ملزمہ کے کان میں کُھسر پُھسر کی
''وہ خود ہی میرے پاس آ گیا تھا''
ساتھ بیٹھے جج نے کرخت لہجے میں کہا
''اب وہ کہاں ہے،،
وکیل نے ملزمہ کی طرف دیکھا
''میرے اندر،،
ججوں کی آنکھوں نے کُھسر پُھسر کی

ساتھ بیٹھے سفید وگ پہنے دوسرے جج نے
میز پہ مکہ مارتے کرخت لہجے میں کہا
''ہم سورج سے ملنا چاہتے ہیں''
ملزمہ نے کہا
''انتظار کرو جب میں اور سورج سوا نیزے پہ آئیں''
ججوں نے سفید وگیں اُتار کر
سفید گول گول ٹوپیاں پہن لیں
اور فیصلے پہ مناجات کی پھونک مارتے کہا
''جب تک سورج سوا نیزے پہ نہیں آتا
مجرمہ کو بغیر کپڑوں کے
برفیلی سُرنگ میں رکھا جائے،،

اچھی کوالٹی کے کوئلے

دیس میں
سوئی گیس کی کمی کی بنا پہ
چولہے برف بنتے جا رہے ہیں
مٹی کے تیل کو
کسی اور فیکٹری میں کام مل گیا ہے
ملاوٹ شدہ برادہ
آگ پکڑنے سے قاصر ہے
مگر

مہرباں ریاست نے
اچھی کوالٹی کے کوئلوں کی بوریاں
لوگوں میں مفت بانٹ دی ہیں

یہ کوئلے
اُن لوگوں کی لاشوں کے
جلنے سے بنے ہیں
جنہوں نے اپنی پسند کی شادیاں کی تھیں
اور
ریاستی مذہب
کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا

خواب دیکھتے مزدور جگنو

ہمارے پیر
کسی اور کے جوتوں میں سفر کرتے رہے
ہماری بستیں
بو کاٹوں سے محروم کر دی گئیں
بے رنگ آسماں پہ
ابابیلیں منہ میں مناجات کی کنکریاں لیے اُڑ رہی ہیں
ہم
اپنے تھکن زدہ جسم لیے

گاڑی کے ایک طرف کے دروازے سے چڑھتے
دوسری طرف کے دروازے سے اُترتے
راحت محسوس کرتے ہیں
ایک ایسی گاڑی
جو سالہا سال سے بغیر انجن کے
گھاس اُگے پلیٹ فارم پہ کھڑی ہے
ہمارے جگنو خواب دیکھنے کی مزدوری پہ لگا دیے گئے
خواب میں چیخنا چلانا کمینگی ہے
میں
جب پہلی بار خواب کے لیے سویا
خواب نے میرے ساتھ
اچھا سلوک نہیں کیا
وہ عورت
ہر وقت جاگتی رہتی ہے
مبادا وہ میرے خواب میں آ کے جاگ پڑے
میں جب جاگ رہا تھا
کاش میں خاموش نہ رہتا
اب خواب میں چیخنا چلانا کمینگی ہے
میں اُسے صرف خواب میں ملنا چاہتا ہوں
خواب اور شاعری میں محبت کرنا ہی
سب سے اعلیٰ محبت ہے

میں اُسے چھوڑ سکتا ہوں
اپنی شاعری کو نہیں
وہ میری شاعری ہے
جسے کوئی بھی ناشر
میرے نام سے چھاپنا نہیں چاہتا

خالی کمرے میں پڑا سیب

میں
پھلوں کی دوکان پہ رُکا
میں پھل نہیں کھاتا
مگر
تیس سالہ ایوا جس مسکراہٹ سے
سیبوں کا لفافہ میرے ہاتھ میں تھماتی ہے
پھلوں کی ساری مٹھاس
اُسکے ہاتھوں میں ہوتی ہے
میں نے
تین دن کی مسکراہٹ کو
چہرے پہ پھیلا کے ایوا سے
دو کلو سیب مانگے

ایوانے کم پڑتے ہوئے
ایک اور سیب جب ترازو میں رکھا
مجھے اُسی وقت محسوس ہو گیا تھا
دور بیٹھی ایک عورت کو مجھ سے محبت نہیں رہی
تین دن بعد
سارے کے سارے سیب تر و تازہ تھے
سوائے اُس سیب کے
جو ایوانے سب سے آخر میں
ترازو میں رکھا تھا

بچپن سے خالی مردہ

کچھ مُردے
اپنے بچپن کے بغیر
ساری زندگی مردہ رہتے ہیں
وہ کسی بچے کو قمیض پہ گری قلفی
کھاتا نہیں دیکھ سکتے
وہ بچوں کو سکارف پہنے
غلطیوں سے مبرا بات کرتا
دیکھنا چاہتے ہیں
گُلی ڈنڈے کے کھیل سے
گُلی کو جلا کر ڈنڈے کو وہ

ساتھ لے کر سوتے ہیں
اور پھر ایک دن
اُن کے جوان بچے
اُن کو اُن کے بچپن کے بغیر دفنا کر
اُن کے بچپن کی پہلی سالگرہ مناتے ہیں

لیچی اور کچنار سے خالی درخت

ہم
خواب دیکھتے ہیں وقفے میں روٹی کے
جب روٹی سے بندھے پونے پہ
قبضہ دیکھتے ہیں فورمین کا
ہم
پیٹ پہ خارش کرتے ہیں
پھر ڈکار لیتے ہیں بھوک کا
اور
خواب دیکھنے لگ جاتے ہیں
اس بلی کا
جسے خالی تھالی میں سوتے ہوئے

صبح گھر چھوڑ آئے تھے

ہم

مشینوں کو روٹی والے پونے میں

بھوک کے ڈکاروں والے پیٹ پہ باندھ کر

کندھا دینے چل پڑتے ہیں

اُس فنکار کی میت کو

جس کی جھولی ساری عمر خالی رہی

مگر

اب اُس کی جھولی بھر دی گئی

کلاشنکوف کی سینکڑوں گولیوں سے

ہمیں

لیچی اور کچنار سے بھرے درختوں کی بجائے

اُن کے تنوں کے ساتھ

دوپٹوں سے لٹکتی نظر آتی ہیں

تازہ تازہ حاملہ لڑکیاں

اور ہم

خواب دیکھنے لگ جاتے ہیں

خوابوں سے خالی نیندوں کے

برف کے اندر پڑی نظم کی گرمائش

لڑکی
ہر پیشی پہ
پونے میں بندھی روٹی کے نیچے
قیدی کے لیے
نظم چھپا کے لاتی
جسے قیدی روٹی کے ساتھ نگل جاتا
رات
اُلٹا لٹکائے جانے پہ
قیدی ساری خوراک اُگل دیتا
سوائے نظم کے

پہرے دار نے پوچھا
''تمہارا جسم برف کی سل پہ بھی
پسینہ میں کیسے شرابور ہو جاتا ہے''
قیدی نے کہا
''بتاؤں گا ذرا نظم اور گرم ہو جائے''

صبح چار بجکر بیس منٹ پہ
سفید وگ پہنے جج نے
قیدی کے ہاتھ میں قلم اور حکم دیا
''اس کو پڑھ کر اس پہ دستخط کر دو''
قیدی نے کہا
''خود ہی دستخط کر لو
میں ان پڑھ ہوں کچھ نہیں لکھ پڑھ سکتا
سوائے نظم کے''

مستقبل میں اکیلا ہو جانے والا آدمی

تو
ابھی ابھی یہیں تھی
تمباکو کو کاغذ میں رول کرنے سے پہلے
تو ابھی ابھی یہیں تھی
جب بوڑھا جانسن
جھیل کنارے باسی روٹی
مسافر پرندوں کو ڈال رہا تھا
جب بس مسافر
کتابیں پڑھتے پڑھتے
ساتھ ساتھ ایس ایم ایس کر رہے تھے

جب دشمن ریڈیو
ہمارے پبوں، لائبریریوں، قحبہ خانوں
عبادت گاہوں، سکولوں
بک شیلف میں پڑی
پڑھی ان پڑھی کتابوں
اور
پارک میں پڑے ہمارے بچوں کے کھلونوں پہ
قبضہ کرنے کی خبریں سُنا رہا تھا
نزدیک کی چیزیں بھولنا
شروعات ہیں
میرا خیال ہے
مجھے مشق کر لینی چاہیے
مستقبل میں اکیلے باغبانی کرنے کی
اور
آتشدان کے سامنے
اکیلے کتاب پڑھتے پڑھتے
تابوت میں خراٹے لینے کی

ہم پیشہ ور سوگوار ہیں

ہم پیشہ ور سوگوار ہیں
ہمارا شمار دنیا کے
بڑے سوگواروں میں ہوتا ہے
چھوٹا موٹا سوگ تو ہم
ریلوے سٹیشن پہ کھڑے کھڑے
بھری بس میں چڑھتے چڑھتے
اور
رش میں جیب کُتری کرتے کرتے منا لیتے ہیں
اگر بڑا حادثہ ہو جائے تو ہم
بڑھی ہوئی شیو کا میک اپ کرا کے
چینلوں کے ٹاک شو میں سوگ منا لیتے ہیں
اس کے لیے ہم بہت محنت کرتے ہیں

دہاڑی پہ رکھے ادیب ہمارے لیے
لغت سے انوکھے انوکھے الفاظ تلاش کرتے ہیں
تاکہ دوسری پارٹی سوگ کے الفاظ میں
ہم سے بازی نہ لے جائے
اگر کوئی ایسا حادثہ ہو جائے
جو لوگوں کی برداشت سے باہر ہو جائے
تو
ہم سڑکوں پہ لگے کھمبے اُکھاڑ کر
کلاشنکوف سے نکالے خون سے
سڑکوں پہ سوگ تحریر کر دیتے ہیں
اور بعض دفعہ
سوگ منانے کے لیے
انسانوں کو بھی جلانا پڑتا ہے
ہمارا شمار دنیا کے بڑے سوگ منانے والوں میں ہوتا ہے
مگر
اب سوگ منانے والوں کا
سوگ منانے کی وجہ سے
اب ہمارے ہاں سوگ منانے والوں کی کمی ہو گئی ہے
ہمیں شاید اب سوگ منانے کے لیے
ماہر سوگوار امپورٹ کرنے پڑیں

گھوڑے کے لیے وقت تھوڑا ہے

وہ اپنے سُموں سے
چکا چوند کرتا
سرپٹ بھاگ رہا ہے
بالکونی میں بیٹھی لڑکی
گھوڑے کی سرپٹ کو نظم کر رہی ہے
نظم کی ہر سطر گھوڑے کو
بالکونی کے قریب تر کرتی جاتی ہے
گرد آلود آندھی
لڑکی کو گھر کے اندر دھکیل رہی ہے
بالکونی کی دروازے کے پیچھے
دروازے پہ میخیں ٹھوکنے والے
ہاتھوں میں ہتھوڑے لیے بیٹھے ہیں
گھوڑے کے لیے وقت تھوڑا ہے

بیہودہ سوچوں سے وزنی ہونا

وہ عورت
مجھ سے چند فاصلوں پہ تھی
اگر میں
اخلاقی جُرأت کرتا
تو اُس کو ذہنی طور پہ حاصل کر سکتا تھا
شرمیلا پن
قوت فیصلہ میں کمی کر دیتا ہے
اب

تیز ہواؤں میں
دروازے، کھڑکیاں بند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں
بیہودہ سوچوں نے
مجھے وزنی کر دیا ہے
اور.....
ہواؤں نے مجھے
ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا ہے

ماں جیسی ریاست

دن بھر مزدور
میرے جسم پہ
سفیدی کرتا رہتا ہے
قحبہ خانے کی عورت
رات کا بوسیدہ میک اپ
میرے جوتوں پہ تھوپتی رہتی ہے
اخباری ہاکر کی آواز، بسوں کے ہارن
ایدھی ایمبولینس کے نغمے
لاکھوں اذانوں
اور بیوی کے کہرام کی خامشی میرے کانوں میں
ڈیرے ڈالے بیٹھی رہتی ہے
مزدور، طالب علم اور لاپتہ افراد کے ورثاء

اپنے احتجاجی کیمپوں کی میخیں
میرے ہاتھوں میں گاڑتے رہتے ہیں

میں تھک جاتا ہوں
میں گر پڑتا ہوں
شہر کا گندہ نالہ
مجھے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے
نالے میں جنسی جرثومے
میرے بدن پہ پستان ڈھونڈتے رہتے ہیں
ریاستی کارندے
مجھ میں خواب آور گولیاں بھر کے
مجھے تجرباتی اسٹریچر پہ پھینک کے
دن بھر کی بخشش
سگریٹوں میں بھرتے رہتے ہیں
رات مجھ کو اپنے اندر
بے نیند خواب بھرنے کی مشقت پہ لگائے رکھتی ہے
صبح ڈاکٹر خوابوں کو
سیکرٹ لفافے میں سیل کر کے
ریاست کو پوسٹ کر دیتے ہیں
ریاست
مجھے ماں کی طرح پال رہی ہے

سیب کے انتظار میں قبر میں لیٹی لڑکی

میں
قبروں کا پیدائشی ہوں
کچھ قبروں کی اور میری پیدائش ایک ساتھ ہوئی
میری زبان نے پہلا ذائقہ
قبر کی مٹی کا چکھا
میں نے قبر کی مٹی سے
گھگھو گھوڑے، بندر ہاتھی بناتے
بچپن گزارا
میں قبروں کے درمیان
شٹاپو کھیلتے کھیلتے جوان ہوا

میں اپنی بھوک
قبروں پہ پھینکے گئے چاولوں سے مٹاتا رہا
میں نے گنتی
قبروں کو گنتے گنتی سیکھی
میں نے پہلا حرف
قبر کے کتبے پہ پڑھا
اور
میری پہلی محبت
قبر میں لیٹی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی
جس نے درندگی کو قتل کر دیا تھا
اور
لوگوں نے اسے سنگسار کر دیا تھا
میں ایوا سے لڑکی کے لیے
دو سیب خرید کر جب سڑک پار کر رہا تھا
تو
سیبوں بھرے ٹرک نے مجھے کچل دیا
اور اب
میں قبروں کا پیدائشی
ہاتھ میں سیب لیے سڑک کنارے قبر کے
اور
لڑکی قبر میں سیب کے انتظار میں لیٹی ہے

بستر میں پڑا ماضی کا لحاف

مجھے جنسی عمل

اور

گوشت خوری سے کراہت محسوس ہوتی ہے

مجھے سبزی بنانا نہیں آتا

مجھے کچھ بھی بنانا نہیں آتا

میں کچھ بھی نہیں کر سکتا

میں

صرف اُس عورت سے محبت کر سکتا ہوں

میں نے کبھی کوئی خواب

بستر میں نہیں دیکھا

بستر میں کبھی کچھ نہیں دیکھنا چاہیے

ہر بستر میں
ماضی کا لحاف پڑا ہوتا ہے
میں
چھپی چیزیں بغیر عینک کے دیکھ لیتا ہوں
مگر
میں سامنے کی چیزیں دیکھنے سے قاصر ہوں
میں نے اُس کی محبت کو
طلوع ہونے سے پہلے دیکھ لیا تھا
میں اُس کی محبت کو
غروب ہوتے کیوں نہ دیکھ سکا
میری عینک کون چُرا کر لے گیا

ایک ٹانگ پہ کھڑی یاد

لوگ محبت کرتے کرتے
کام کرنے لگ جاتے ہیں
مکان کی تعمیر کرانے لگ جاتے ہیں
افسر کے گھر
سبزیاں پہنچانے چلے جاتے ہیں
درزی، نائی اور کار مکینک سے
جھگڑا کرنے لگ جاتے ہیں
محبوباؤں کے اُتارے گجرے
بیویوں کو پہنانے لگ جاتے ہیں
میں
کام کرتے کرتے

محبت کے لیے رُک گیا تھا
وہ عورت بھی رُک گئی تھی
ساری کائنات رُک گئی تھی
مگر.....

عورت نے سفر جاری رکھا
کائنات نے بھی چلنا شروع کر دیا ہے
کائنات اُس عورت کے ساتھ مل گئی ہے
میں وہیں رُکا رہا
میں نے کچھ نہیں کیا سوائے اُسے یاد کرنے کے
کاش کوئی میری نظموں کی پوٹلی
اُس تک پہنچا دے
وہ عورت مجھ سے خوف زدہ نہیں
میری پوٹلی میں بندھی نظموں سے خوف زدہ ہے
مگر
میں نے اُس کی آنکھوں میں محبت دیکھی ہے
میں
اُس کی یاد کی ایک ٹانگ پہ کھڑا ہوں
وہ
اپنی آنکھوں اور میری محبت سمیت آئے گی
مجھے
اپنی محبت میں دفنانے کے لیے

کھوئی ہوئی عورت کا درخت

میں
درختوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا
مجھے اُن کی چھاؤں سے کوئی غرض نہیں
میں اُن کو دیکھتا رہتا ہوں
جب چاند اُن سے لُک چُھپ کا کھیل کھیلتا ہے
جب سورج اُنہیں اپنی آگ میں جلاتا ہے
جب بچے اُن کے پھلوں سے
اپنے ہونٹ اور قمیضیں رنگ دار کرتے ہیں
جب تو اُن پہ جھولا جھولتی ہے
جب بارش کے بعد پتوں سے
قطرے یوں گرتے ہیں
جیسے تیرے ساتھ گزارے دن

میں
اُس عورت کی یاد کے تنے کے ساتھ
ٹیک لگائے بیٹھا رہتا ہوں
درخت اب کہیں نہیں ہیں
وہ عورت بھی اب کہیں نہیں ہے
میں بھی اب کہیں نہیں ہوں
کوئی بھی اب کہیں نہیں ہے
میں صرف خیال میں زندہ تھا
الفاظ نے خیال کو مار دیا ہے
الفاظ کائنات کی ارتقا میں
سب سے بڑی رکاوٹ ہیں
میں درختوں کے بغیر زندہ نہیں رہنا چاہتا
میں اپنی تنہائی میں
کسی کو شامل نہیں کرنا چاہتا
خود کو بھی نہیں
اُس عورت کو بھی نہیں
جس نے مجھے تنہا کر دیا
میں اُس عورت کی یاد کے تنے کے ساتھ
ٹیک لگائے بیٹھا رہتا ہوں
جواب کہیں نہیں ہے
مگر.....جس نے مجھے درخت بنا دیا ہے

ٹوٹی ہوئی سڑکیں

مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے

وہ

میری طرف آ رہی ہے

میں

شیو بنا کے، بالوں کو ڈرائی کر کے

تھری پیس سوٹ، سُرخ رنگ کا اسکارف پہن کر

دس سال پہلے خریدی کونیاک نکالتا ہوں

سالوں پہلے خریدا گیا ہوانا کا

ادھ بجھا سگار سُلگاتا ہوں

مگر

موت ٹوٹی سڑکوں کی وجہ سے

خود آنے کی بجائے ادھ موئی زندگی

میری طرف روانہ کر دیتی ہے
موت کی طرف سے بھیجی گئی زندگی
جو خود ادھ موئی ہے
موت کا کیا دروازہ کھولے گی
مجھے
خود موت کو مارنا ہوگا
تا کہ
بھرپور زندگی گزار سکوں

سمندر کی واپسی

سمندر
مجھے تحفہ میں ملا
اُس نے میرے
سارے خطوط، بدھا کا مجسمہ
شفون کا سکارف، جولیا مزار سے کا ناول پیلی بارش
تھیٹر، فلم، پلیٹ فارم کے ٹکٹ
پھولوں، سیبوں والی ایوا کا فون نمبر، ادھ پیے سگریٹ
اور
بوسوں کی خواہش واپس کر دی
میں
اُسے سمندر کیسے واپس کروں
وہ میری آنکھیں
اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی

نوٹ! سپینش ادیب julio LlaMazares کا ناول Yellow rain

شُکر گُزار آدمی اور سُرخ شراب

گھر سے بازار تک
درختوں کے نیچے پڑے
بینچوں پہ بیٹھ بیٹھ کے
ہر روز بازار جاتا ہوں
سُرخ وائین اور ایک پھول خریدتا ہوں
گھر میں داخل ہو کے
ایک ہاتھ باہر نکال کے
دروازے کے ساتھ لگی بیل بجاتا ہوں
باہر منتظر پھول پکڑے ہاتھ کو
اپنے دوسرے ہاتھ سے زور سے دبا کر
اُسے اندر بلاتا ہوں

اُس ہاتھ سے پھول وصول کر کے
پھول کو اُس گلدان میں پڑے
دوسرے خُشک پھولوں کے ساتھ رکھ دیتا ہوں
بس کبھی کبھار
بے احتیاطی ہو جاتی ہے
خُشک پھولوں میں سے کوئی ایک پتی
آنسو کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتی
اور.....اور
ٹوٹ کر گلدان میں پڑی ٹوٹی پتیوں میں شامل ہو جاتی ہے
میں دو گلاسوں میں
سُرخ وائین انڈیلتا ہوں
دونوں گلاس اُٹھائے
ہُرے کا نعرہ لگاتا ہوں
کبھی میں واش روم جاتا ہوں
تو دوسرا گلاس
جمپ لگا کر میرا سُرخ شراب کا گلاس
بوٹم اپ کر جاتا ہے
اور کبھی.....کبھی میں اُسے کچن سے
لہسن والے کباب لانے کا کہتا ہوں
اور جلدی جلدی پینے کے چکر میں
اُس کا بھرا گلاس گرا دیتا ہوں

میں
اینجل ایبٹ کا پلے ریکارڈ
'' دا لاسٹ ورلڈ'' لگا کر
اپنا ایک ہاتھ
دوسرے ہاتھ کی کمر میں ڈال کر ڈانس کرتا ہوں
جب میں اپنے لب
دوسرے ہاتھ کے لب تک لے کر جاتا ہوں
تو
دوسرا ہاتھ مجھے پکڑ کر دروازے تک لے جاتا ہے
میں دوسرے ہاتھ کی پوروں کو
آنکھوں سے لگا کر الوداع کرتا ہوں
دوسرا ہاتھ پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہے
تو میں اُسے ہوائی بوسہ دیتا ہوں
حسین عابد کی نظم کی دو لائنیں سناتا ہوں
''ایک وہ ہے جو ہر جگہ ہے
ایک میں ہوں جو کہیں نہیں ہوں''
سونے سے پہلے
سُرخ وائین بوٹم اپ کرتا ہوں
اور شُکر کرتا ہوں
آج رات بھی اُداسی اور تنہائی
میرے گھر اور میرے اندر داخل نہیں ہوئی

خواب بن جانے کا خواب

میں تجھے کبھی بھی
دن کی روشنی میں
مکمل نہیں دیکھ پایا
رات
میرے لیے صرف
تجھے خواب میں دیکھنے کا نام ہے
تو اب بھی
مجھے خواب میں پوری نظر آتی ہے
اس سے پہلے
دن ہمیں بھسم کر ڈالے
آؤ
ہم خواب بن جائیں

سمندر کا صحرا

میں
دریا کو چاروں اور اوڑھے
اُس کے کنارے کھڑا رہا
اُس کی لہریں
مجھے آغوش میں لینے کے لیے اُچھلتی رہیں
اُس کے بھنور
میرے کانوں میں رس گھولتے رہے
اُس کی سیپیاں
میرے گلے کے منکے، کانوں کی مندریاں

اور پیروں کے کڑے بنتی رہیں

اور

جب میں اُس کے درمیان گیا

تو سمندر مجھے

اپنے صحرا میں چھوڑ کے

نہ جانے کدھر چلا گیا

بارشوں کے غسل خانے

میں
چلتے چلتے اُس عورت کے لیے رُک گیا تھا
بسیں
مسافروں سے بھری پڑی ہیں
محنت کش جیب کُترے
دن رات اپنے کاموں میں جُتے ہوئے ہیں
انسان بارش سے محبت کرنا کب سیکھے گا
ایک نیا جبر کرنے کے لیے
دن رات جبر کے خلاف جلوس نکل رہے ہیں
ہر روز ایک نیا آرڈی نینس

فوک دھنوں میں گایا جا رہا ہے
لوگ بارشوں میں نہانے کے بعد
غسل خانوں میں جا کر نہاتے ہیں
بھکاری
سارے دن کی کمائی
غیر ملکی کرنسی میں تبدیل کروا رہے ہیں
سب بکواس ہے
کوئی کائنات وائنات نہیں رُکتی
وہ عورت بھی نہیں
جس کے لیے میں چلتے چلتے رُک گیا تھا

خالی پن

ہر وقت عورت میں
عورت پن
نہیں ڈھونڈنا چاہیے
کیا ہر مرد میں
مردانہ پن ہوتا ہے
قبروں میں کچھ تابوت
لاشوں کے بغیر دفن ہیں
لوگ ساری زندگی

خوابوں سے خالی
نیند لیتے ہیں
اور خوابوں پہ نظمیں لکھتے ہیں
برف، سورج اور وہ عورت
ساتھ ساتھ ہیں
مگر
میرا کشکول ان سب سے خالی ہے

حبس میں پیدا ہونے والا بچہ

ہوائیں
جب ہم بستری کرتے کرتے
تھک جاتی ہیں
تو آسمانوں کے دروازے
بند کر کے سو جاتی ہیں
ایسے موسم میں
پیدا ہونے والے بچے کا نام
حبس رکھا گیا

جو تمام عمر نفرت کا شکار رہا
ہوا سے سب سے زیادہ محبت
پتنگ باز کرتا ہے
مگر
پتنگ باز کی چرخی
حبس میں پیدا ہونے والے
بچے کے ہاتھ میں ہے

سکّوں کے بغیر پنسلیں

رات کا کھانا کھاتے ہوئے
جب میں
کھانے کے کورس کا
آخری گلاس پی رہا تھا
سارے گلاسوں پہ اچانک
وہ پینٹ ہوگئی
جب میں کاغذ لیے
اُس کی تصویر بنانے لگا
تو ساری پنسلوں کے سکّے

ٹوٹے ہوئے نکلے
میں آنکھیں بند کر کے
Anton Bruckner کو سُننے لگا
جس کی دھن جذبوں کو جگاتی ہے
اور اُس یاد کو تمہارے سامنے
کرسی پہ لا بٹھا دیتی ہے
جو کبھی تھی ہی نہیں

تنہائی کا کورس

وہ
چھوڑ جاتے ہیں
تنہا مجمع میں مجھے
جب وہ دیکھتے ہیں
میں
بالکل تنہا ہو گیا ہوں
اور
الاؤ جلاتے ہیں
اکٹھی کی گئی
ایک رسّی سے بندھی لکڑیوں سے
اور کورس گاتے ہیں تنہائی کا

ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے کپڑے

اب وہ
یہاں نہیں ہے
وہ کبھی بھی یہاں نہیں تھی
اب اُس کی محبت بھی یہاں نہیں ہے
مگر
کُرسیاں، میز اُسی جگہ پہ ہیں
گلدان
کھانے کی میز پہ وہیں کھڑا کھڑا
صبح، دوپہر اور رات کا کھانا کھاتا رہتا ہے
بک شیلف میں ویسے ہی
کچھ کتابیں
لیٹی اور کچھ کھڑی ہیں

الماری میں
اُس کے اور میرے کپڑے
ایک دوسرے سے اُسی طرح
بغلگیر ہوتے رہتے ہیں
میں
ہر شام گھر لوٹتے ہوئے
ایک پیاز، بیف کا ایک ٹکڑا
پانچ ڈبے بیئر اور
اسکینڈلوں سے بھرا شام کا اخبار خریدتا ہوں
غم کی نمائش کے لیے
دفتر میں ضروری کام کی چھٹی کی
درخواست نہیں دینی چاہیے
بغیر محبت کے
غم اور صدمے کو نہیں سمجھا جا سکتا
غم کو محبت سے
اپنے اندر رکھنے سے
غم
غم کا مداوا بن جاتا ہے

دھمکیوں کی امر بیل

وہ عورت
ہر روز مجھے دھمکی دیتی ہے
میں ہر روز
اُسے اُس کی دھمکی یاد دلاتا ہوں
نہ وہ دھمکی دینا بھولتی ہے
نہ میں اُسے اُس کی
دھمکی یاد دلانا بھولتا ہوں
نہ امر بیل اُگنا بھولتی ہے
مگر
امر بیل کاٹنے والی قینچی کہاں گم ہو گئی

اس سگریٹ کے ختم ہونے سے پہلے پہلے
مجھے فیصلہ کرنا ہے
نئی قینچی خریدوں
یا
اسی عورت سے سمجھوتہ کرلوں

توہینِ خوابِ محبت

خوابوں کی بددعا سے بچنا چاہیے
خوابوں کا کبھی ناجائز استعمال نہیں کرنا چاہیے
تم سے جو
خوابوں میں محبت کرے
اُسے کبھی مت جگاؤ
اُس سے جاگتے میں
محبت کا تقاضا کرنا
توہینِ خوابِ محبت ہے
میں ایک بار
توہینِ خوابِ محبت میں پکڑا گیا ہوں
اُس وقت سے
نہ کوئی خواب آیا
نہ جاگ آئی

دو حصوں میں بٹا بستر

میں
اُس عورت کے ساتھ لیٹے لیٹے
بُک سٹال پہ کھڑے کھڑے
کتابیں پڑھتا رہتا ہوں
چائے کے کپ میں
سگریٹوں کے ٹوٹے پھینکتا رہتا ہوں
نائی کے کھردرے اُسترے سے
شیو کراتا رہتا ہوں
اُس عورت کی مختلف برتنوں میں چھپائی ریزگاری
نکال کر پب میں بیٹھا پیتا رہتا ہوں
مگر
میں فوری نہانے چلا جاتا ہوں

یہ عورت کتنی پاک صاف ہے
یہ کبھی نہانے نہیں جاتی
اچھا کبھی تو یہ بھی
میرے ساتھ لیٹے لیٹے
ساڑھی رنگ کروانے بازار جائے گی
پڑوسن سے اُدھار آلو مانگنے جائے گی
بس میں سوار ہوتے ہوئے
بٹوا گھر بھول آنے پہ
پریشان ہوگی
کبھی تو یہ بھی گندی ہوگی
کبھی تو یہ بھی نہانے جائے گی

خُدا اور فوٹو گرافر

شہر کی آگ اُگلتی سڑکوں پہ
نوجوان
پھٹی بنیانوں
زخمی سینوں کے ساتھ
سچائی کی شراب پی پی کر
مدہوش ہوتے ہوئے رقص کر رہے ہیں
لڑکیاں
ننگے پاؤں
کھلے بالوں کے ساتھ
خون رنگ بارشوں میں نہا رہی ہیں
اور.....اور بچے

تتلیوں کا پیچھا کرتے کرتے
جیپوں اور بھاری بوٹوں تلے
کُچلے جا رہے ہیں
ایسے میں دوستو
تم ایک ہاتھ میں قلم
اور
دوسرے ہاتھ میں کاغذ پکڑے
ہوٹلوں کی کھلی کھڑکیوں سے
انہیں مت دیکھو
کہ ظلم ہوتے دیکھنا
صرف اور صرف
خُدا اور فوٹو گرافر کو ہی زیب دیتا ہے

جعلی نکاح ناموں پہ خُدا کے دستخط

ہماری نیندیں
سلاخوں کے پیچھے
ہزار ہا پاور کے بلبوں کے اندر جاگتی رہیں
خوابوں کی تعبیریں
برف کی سلوں میں منجمد ہوتی رہیں
ادھ بجھے سگرٹوں سے
ہمارے جسموں پہ نقش و نگار بنائے گئے
خواہشیں

کسیلی چائے کے کپوں میں تیرتی رہیں
ہم
چُنریوں سے اُلجھ کر گرتے رہے
چُنریاں ڈولیوں میں بیٹھ کر
شہنائیوں کے سُروں میں رخصت ہوتی رہیں
اور ہمارے حصے میں
وہ ہم بستریاں آئیں
جو نمازوں کے قضا ہونے کے خوف میں مبتلا رہیں
پڑوسن سے کشیدہ کاری کے
نمونے نقل کرتی رہیں
سویٹر بُنتی رہیں
اور بچے جنتی رہیں
بقول فرخ یار
''ہم صرف پیشی بھگتانے کے لیے آتے رہے''
ہماری فائلیں
دیمک کا پیٹ بھرنے کے لیے
میز کی ٹوٹی ٹانگ کے نیچے رکھ دی گئیں
اور.....اور پھر ایک دن
پہرے داروں نے
ازار بند نیفوں میں ڈالنے کی بجائے
ہمارے گلوں میں ڈال دیئے

فٹ بال

نہیں پتا مجھے
اس نظم کی تخلیق کے وقت کا
اور نہ ہی تخلیق کار کا
تخلیق کار کی پیدائش کے وقت
دائی اماں
گھڑی نکالنا بھول گئی پیٹ سے
اور وقت
نظم کا بایاں بازو کاٹ کر لے گیا
انور سن رائے بجاتا رہتا ہے
چرچ کا وہ گھڑیال

گھڑا گیا جو پلاسٹک کی فیکٹری میں
اور جو پھاڑ رہا ہے
میرے بائیں کان کا پردہ
ہم
مصروف ہیں لاشوں کو اُٹھانے میں
تا کہ جلد از جلد دفنا سکیں
لاشوں کو ان کے سروں سمیت
مبادا لاشوں کے سر
اُن کے ہاتھ لگ جائیں
جو لاشوں کے سروں سے کھیلتے ہیں فٹ بال

نوٹ: یہ نظم انور سن رائے کی نظم سے متاثر ہو کے لکھی گئی

تنہائی کا موٹاپا

میں
تنہائی کے موٹاپے پہ
قابو پانے کے لیے
دن رات فیس بک پہ
ایکسرسائز کرتا رہتا ہوں
میں
کئی بار موت کے قریب سے گُزرا
کئی بار
زندگی میرے قریب سے گُزری
جانے کب میری پروفائل کا فور ہو جائے
میں چاہتا ہوں تم مجھے
اپنے دل کی ہارڈ ڈسک میں محفوظ کر لو

سوانیزے پہ سنومین

سال ہا سال سے
ہڈیوں کا گودا
مجھے منجمد نہ کر سکا
سورج
سوانیزے پہ بھی میرا تھا
میں
اُس کے لیے نظم لکھتا رہا
جس کے سرد پن نے
جون، جولائی کے مہینوں میں مجھے
سنومین بنا دیا
میں
اُس کے لیے نظم لکھتا رہا
جس کی محبت کی تپش نے مجھے
سورج کی پیدائش سے پہلے پگھلا دیا

نظمیں جو مجھے پھاڑنی پڑتی ہیں

میری نظموں کو
فرانسیسی وائین پسند ہے
اور
کچھ نظموں کے مصرعے
روسی ووڈکا پیتے ہیں
نظموں کے عنوان صرف
فرانسیسی کونیاک اور سکاٹ لینڈ کی وہسکی سے بنتے ہیں
نظموں کی کچھ لائنیں
جگراتے کے گھنگھرو باندھے
ڈھول پہ بھنگڑا ڈالتے آتی ہیں
مگر!
کچھ نظمیں نان الکوحل
اور.....نیند کے بستر پہ
خراٹے لیتی رہتی ہیں
ایسی نظموں کو مجھے پھاڑنا پڑتا ہے

جاگتے خوابوں کو سُلانا

نظم
لکھنے کے لیے
کنویں سے پانی نکالنے
جتنا زور نہیں لگانا پڑتا
بس
اکیلے سفر کرتے
دو ٹکٹیں خریدنی پڑتی ہیں
راستے میں ایک اخبار اور ایک رسالہ خریدنا پڑتا ہے
فلم کے وقفہ میں
دو پلیٹیں سموسوں کی
الگ الگ لفافوں میں ڈلوانی پڑتی ہیں
ایک بوتل

اور دو گلاس خریدنے پڑتے ہیں
اور پھر.....گھر آ کر
اخبار اور رسالہ
خود ہی پڑھنا پڑتا ہے
لفافوں سے نکال کر دونوں پلیٹیں سموسوں کی
خود ہی کھانی پڑتی ہیں
دونوں گلاسوں میں باری باری ڈال کر
ساری بوتل
خود ہی پینی پڑتی ہے
بستر کی چادر پہ شکنیں ڈال کر
ساری رات
اکیلا کُرسی پہ بیٹھ کے
جاگتے خوابوں کو سُلانا پڑتا ہے

ہنی مون مناتے گدھ

نقشہ نویس نے
پھولوں کا باغ، قبرستان
اور
دلہن کا گھر ساتھ ساتھ بنائے
لیکن نہتے پھول
دلہن اور قبر تک جاتے جاتے
راستے میں لُٹ گئے
لاشوں پہ پھول ڈالنے کے لیے
اور پھولوں کو لاش بنانا پڑتا ہے
پسماندگان کی چیخوں میں
کفن سیتے درزی کے بچوں کی فیس
قہقہے لگاتی رہتی ہے

ایک ہاتھ میں بندوق
دوسرے میں پھول
اور..... نیفے میں عقیدے کے خنجر ڈالے
دندناتے پیشواؤں کی مقدس زمین پر
ہنی مون منانے کے لیے
گدھ
جوق در جوق آ رہے ہیں

سائیکل چلاتی آتی موت

مسعود قمر

تمہیں کیا ہو گیا ہے
دوستوں کو کیوں تنگ کرتے ہو
دوستوں نے
اپنی دوکانیں کھولنی ہوتی ہیں
نائی سے اپنے بال بنوانے ہوتے ہیں
بچوں کی سائیکل ٹھیک کروانی ہوتی ہے
محبت نہ پانے کے غم میں
بالکونی میں پودوں کو
تین تین بار پانی دینا ہوتا ہے
پیٹ کو سائیکل پہ رکھ کے
دفتر جانا ہوتا ہے
محبوباؤں کے اُتارے گجرے

بیویوں کو پہنانے ہوتے ہیں
افسروں کی غزلوں کے تیور
درست کرنے ہوتے ہیں
ایسے موسم میں وہ
تمہاری نظمیں ایسے پڑھتے ہیں
جیسے دفتری نظم وضبط کا فرمان
لہٰذا باز آؤ
اور انہیں زندہ رہنے دو
خود
کھڑکی کے پاس بیٹھے
گلہری کو درخت پہ چڑھتے
اور
جانسن کو پوتے کے ساتھ کھیلتا دیکھو
اور.....اور خود
اپنی محبوب موت کا انتظار کرو
جو آئے
اور تم کو ایک پہیے والی
سائیکل پہ بیٹھا کے لے جائے

ہواؤں کا پوسٹل ایڈریس

ہواؤں کا
کوئی پوسٹل ایڈریس نہیں ہوتا
مگر ہوائیں
ہر پتہ پہ پہنچ جاتی ہیں
ہواؤں کو
ناراض نہیں کرنا چاہیے
وگرنہ
گلابوں کو لکھے گئے خطوط
دی ہاؤس آف لوسٹ لیٹرز
میں بھی نہیں پہنچ پاتے

واش بیسن کی خراخراہٹ

میں نے
خودکشی کرنے کے لیے
گھر میں ایک دریا بنایا ہے
چند سیڑھیاں
نیچے جاؤ
یا
اوپر آؤ
دریا شروع ہو جاتا ہے
لیکن
واش بیسن کی ڈراؤنی خرخراہٹ
خودکشی میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے

موت سے اُکتاہٹ

مجھے
پیدائش کے لیے
خودکشی کرنی پڑے گی
میں
موت سے تنگ آ گیا ہوں
پُل کی لکڑی کے لیے بہت سے
درخت کاٹنے پڑتے ہیں
خودکشی سے ہوئی پیدائش
مجھے پُل بنا سکتی ہے

خراٹوں سے خالی پوٹلی

لڑکی نے
گھر سے بھاگنے کے لیے
رات کا پچھلا پہر چُنا
جب سارا گھر
اپنی اپنی نیند کی پوٹلی میں
خراٹے گن رہا تھا
لڑکی نے
پتھر کے زیور، عاج کا چوڑا
اور اپنی کھڑاویں
درخت کے نیچے رکھیں
سالوں کی سنبھالی پوٹلی کو
گھڑے سے نکالا

اور
ندی کی طرف چل پڑی
صبح لوگوں نے دیکھا
پوٹلی میں بندھی نظموں نے
ساری ندی کو نظم بنا دیا ہے
اور لڑکی
ندی کی آخری تہہ میں
نئی نظم لکھ رہی ہے

کتابوں میں پڑا بوسہ

تمہارا بوسہ
میری بک شیلف کی
ہر کتاب میں پڑا ہے
میں
اُن کتابوں کے گیت گا تا رہتا ہوں
جن کی دُھن تم نے بنائی تھی
میں
جب تمہارا پھول بن کر
ندی میں بہہ رہا تھا
تو

کپڑوں بغیر نہاتی عورتیں
مجھ پہ ٹھٹھہ لگا رہی تھیں
مگر
ایک لڑکی کی آنکھ میں
میری نظم بہہ رہی تھی
میں
پھول بنوں یا آنسو
میں تیری آنکھ کی ندی میں
بہنا چاہتا ہوں

آزادی میں جکڑے ہوئے لوگ

(جاوید انور کے نام)

پنجاب میڈیکل کالج
انیس سو بیاسی پانچ دسمبر کی گھاس
کتنی جوان اور ننگی تھی
باتوں کے مرغولے تھے
سگرٹوں کے ٹوٹے باتیں کرتے تھے
لڑکیاں
سفید گاؤن پہنے
گلے میں سٹیتھوسکوپ ڈالے
گزر رہی تھیں
جن میں اُن کے منگیتروں کی

دبئی سے خریدے ٹیپ ریکارڈروں کی
آوازیں دھڑک رہیں تھیں
ذیل گھر کی دیواروں پہ نظم
''غلام ہر شب آقاؤں کو سُلا کر ہی سوتے ہیں''
کا نیا نیا رنگ وروغن ہوا تھا
انیس سو بیاسی کی گھاس
جاوید انور پورے کا پورا لیٹا
آزادی میں جکڑے ہوئے شہروں میں
رہنے سے منکر ہو رہا تھا
شہر کے ہوٹلوں کی میزوں پہ
جاوید انور، افتخار فیصل اور وحید احمد کی نظموں کی
اذانیں با جماعت سُنی جاتی تھیں
الجاوید ہوٹل میں جاوید انور
کامیو، سارتر اور کافکا کے لیے
چائے کا آرڈر دے کر
سگرٹوں کے لیے پریشان ہو رہا تھا

لاہور

دو ہزار گیارہ ۲۵ نومبر
جاوید انور خامشی کا چوغہ پہنے
پورے کا پورا لیٹا
آزادی میں جکڑے ہوئے شہروں میں

رہنے سے منکر
مٹھی کھولے بغیر تماشہ دکھا رہا تھا
سٹاک ہولم
دو ہزار گیارہ پانچ دسمبر کی گھاس
برف میں ستر پوش
آگ اُگل رہی ہے

بارش بھرا تھیلا

میں
ایک گھر بنانا چاہتا ہوں
جس میں صرف دروازے ہوں
جو کبھی نہ کھل سکیں
میں باہر سیبوں کا تھیلا لیے کھڑا رہوں
بارش
تھیلے میں جمع ہوتی رہے
میرے آس پاس
تین پہیے والے سائیکل
اور
کاریں چلتی رہیں
میں جب تھیلے سے سیب نکالنے لگوں
تو تھیلے میں سے صرف
بارش نکلے

ڈرپوک بارش

رات
بارش نے رحم کھا کر
میرے اندر
برسنا بند کر دیا
اُسے میرے اندر
سوراخوں بھری چھت کی
مخبری ہو چکی تھی
میں نے اپنے جسم کی فصل میں
کبھی رحم اور خیرات کا بیج نہیں بویا
اب میں ایک ہاتھ میں

سوکھا جسم
دوسرے میں
سوراخوں بھری چھت لیے
بارش کو آسمانوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں
مگر بارش
سالی! ڈرپوک بارش
کہیں نہیں مل رہی

پلید شبد

عورت
محبت اور نظم پیٹ میں پالتی ہے

وہ
آدمی کے مذہبی بیانیے کی وجہ سے
کسی اور مرد سے ہم بستری
کرنے پہ مجبور ہوئی
مگر
عورت پیٹ میں قہقہہ لگاتے
بچے کے کان میں
اُس آدمی کی اذان دیتی رہتی ہے
خُدا نے

پلید شبد مسترد کرتے
تھوک عورت کے پیٹ پہ تھوکا
بچہ سماعت اور گویائی سے محروم ہو گیا
مصروفیت کی بنا پہ خُدا
بچے کو بینائی سے محروم کرنا بُھول گیا
عورت
پیٹ پہ اپنی انگلی کی پوروں سے
اُس آدمی کی اذان لکھتی رہتی ہے
بچہ اذان پڑھتا رہتا ہے

نیندوں کے احسان اُٹھائے

(قیوم ناصر دی ویل)

قیوم ناصر
ہم جو
ساری عمر معجزوں کے منکر رہے
ساری عمر کسی واقعے، کسی حادثے کے منتظر رہے
ہم تم
سردیوں کی دھوپ کے ساتھی ہیں
جب فُٹ پاتھوں پر
چیخوف، منٹو، بیدی، کامیو، کوک شاستر بمعہ تصاویر
موٹاپے کا علاج، مشہور فلمی گیت
اور ماں کی دعا کے کتابچے بکتے تھے
سو.....اب چرغے، تکا بوٹی
کڑاہی گوشت بیچنے والے شہروں میں

فٹ پاتھوں کا کیا کام

قیوم ناصر

روگ سے نجات حاصل کرنے کے لیے

پناہ گاہیں چھوڑنی پڑتی ہیں

گوتم

اگر پناہ گاہ نہ چھوڑتا تو

روگ سے نجات کیسے پاتا

میرے لیے یہ خبر ہے

شہر میں لوگ نیند لیتے ہیں

اور اُن کو خواب آتے ہیں

تم نے بھلے وقتوں میں

نیندوں کے احسان اُٹھائے

لیکن خواب نہ آئے

معافی چاہتا ہوں

''بھلا وقت'' لکھ گیا ہوں

یہ کب آیا تھا؟

لہٰذا ازالے کے لیے

میں تیز برانڈی

اور تم

تیز پتی والی چائے اور تیز تمباکو پیو

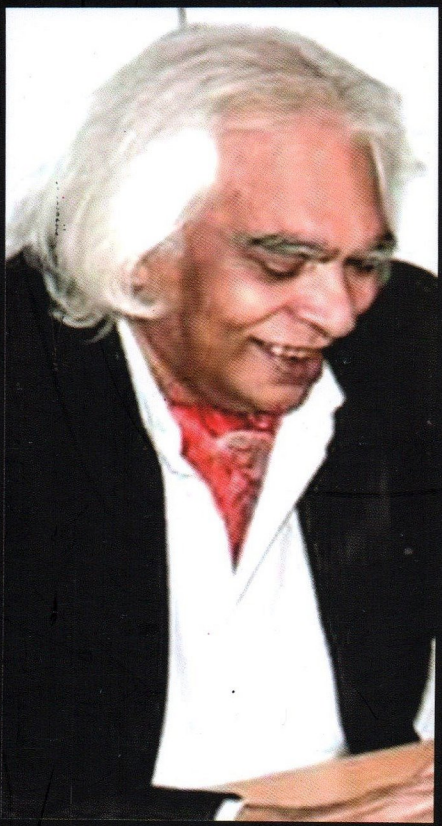

ایک انسان دوست، ہنستے مسکراتے ہوئے بے پناہ مخلص شخص کا نام مسعود قمر ہے۔ دوستوں کے دوست ہیں، سہہ جانے کے ہُنر سے خوب آشنا، چھوٹے بچے کے جیسا معصوم دل رکھنے والے اس شخص نے دوستوں کے علاوہ شاعری میں نظم کی اُنگلی بھی تھام رکھی ہے اور ساتھ ہی ماننے والی بات یہ بھی ہے کہ ان کی نثر بھی ایک سندر خیابان سے کم نہیں ہے آپ ایک قدم وہاں رکھیے پھر گھر واپس آنے کو جی نہیں چاہے گا۔ ان کی نظم میں جہاں سیبوں جیسی سندر ایوا رہتی ہے وہاں ایک اور عورت بھی ہے جس سے مسعود قمر خوف زدہ اور خفا ہیں، مزے کی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنی نظم میں ایوا سے زیادہ اس عورت سے قریب ہیں جس سے خائف رہتے ہیں۔ مجھے ان کی نظم میں ایک اداس شام کا رنگ ملا اور اسی رنگ کی فضا میں انہوں نے متعدد مضمون نظم کیے۔ ان کی نظم میں جو کچھ بھی ہے وہ کہیں سے سمگل ہو کر نہیں آیا۔ جو لکھا اور یجنل لکھا ہے۔ اور یہی ان کے انفرادی شعور کا سرمایہ ہے۔

شہناز پروین سحر

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 3314686276
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN:978-969-593-325-1
9 789695 933251

پڙهندڙ نسُل . پَ ن

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندَڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندَڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، جُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياڃوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙَهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنيٰ e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪارِي تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعوىٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہِ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳِئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. پين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصي ۽ ٽالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪَبِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَ پاران ڪتابن کي ڊِجيِٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيِٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَ سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَئَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکَڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو بوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛

ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛

گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،

جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ بنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ -

اِن حسابَ سان اٽجاٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاٽي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۾ سماجي حالتن تان نظر کڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بڻائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اڻٽر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ڀاڪي پائي چيو تہ ”منهنجا ڀاءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)